

آہنگِ شمیم

صفیہ شمیم ملیح آبادی

ادیب اور شاعر حضرات

ہر ملک و ملت کا مقدس سرمایہ ہوتے ہیں۔ زندہ قومیں، اپنی زندگی سے زیادہ اس سرمایہ کو عزیز رکھتی ہیں۔ ہمارے پاکستانی معاشرہ میں بے شمار ایسے فن کار موجود ہیں جن کی تخلیقات ادبیاتِ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں اور ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جنہیں بہتر مواقع فراہم کر دیے جائیں تو وہ دنیا کا بہترین ادب تخلیق کر سکتے ہیں لیکن بیماری، افلاس، غربت اور ذرائع آمدن نہ ہونے کی وجہ سے وہ تخلیقی کاموں پر توجہ نہیں دے سکتے

لہٰذا بجائے اس کے کہ ان کے مرنے کے بعد ہم ان کی عظیم یادگاریں قائم کریں، کیوں نہ انہیں سہارا دے کر ملک و ملت کے لئے مفید و کارآمد بنایا جائے۔ لہٰذا

مکتبۂ دارالادب لاہور

نے اپنی تمام نئی مطبوعات کی کُل آمدن ایسے ہی پاکستانی ادباء و شعراء کی امداد کیلئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

مکتبہ کی سرپرستی فرمائیے آپ کا معمولی سا تعاون، ہزاروں بجھتے ہوئے چراغوں میں زندگی کی نئی روشنی پیدا کر سکتا ہے اور آپ لاکھوں ٹوٹے ہوئے دلوں کی دعاؤں کا مرکز بن سکتے ہیں۔

شکریہ!

ناشران

مکتبہ دارالادب۔

۱۱۔ رتن سٹریٹ۔ عبدالکریم روڈ، لاہور

آہنگِ شمیم

صفیہ شمیم ملیح آبادی

تعداد ۲۰۰۰

طبعِ اوّل نومبر ۱۹۵۷ء

قیمت :- چار روپے دس آنے

کتاب ملنے کا پتہ

صُبحِ نَو

۹۲۸ بی۔ سٹیلائیٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

فہرست

"تعارف"

صفیہ شمیم، میری چھوٹی بہن انیس جہاں کی بڑی لڑکی یعنی میری حقیقی بھانجی ہے۔ اور شاعری، کئی پشتوں سے چھنتی چھناتی اور کھلتی کھلاتی، ایک خوشگوار میراث کی صورت میں، اُس تک پہنچی ہے۔

میرے بزرگوں میں سب سے پہلے معلوم شاعر تھے میرے پردادا حسام الدولہ، تہوّر جنگ نواب فقیر محمد خاں بہادر گویا۔ گویا سے یہ میراث ملی اُن کے بیٹے اور میرے دادا نواب محمد احمد خاں بہادر احمد صاحبِ "مخزن الآلام" کو۔ احمد سے یہ میراث ملی۔ اُن کے بیٹے اور میرے باپ نواب محمد بشیر احمد خاں بہادر بشیر کو، حضرت بشیر سے رُخ کیا اس وراثت نے، شاید کسی قدر بے رُخی کے ساتھ، اُن کے بیٹے یعنی میری طرف، اور پھر مڑ گیا یہ جوہر میری بھانجی شمیم کی جانب۔

ہمارا خاندان، ماشاء اللہ، ایک لشکر خاندان ہے، صرف میرے دادا حضرت احمد، کم و بیش، ایک سو دس بچوں کے باپ تھے، جن میں سے غالباً اسی (۸۰) بچوں کے نام میرے پاس موجود و محفوظ ہیں۔

لیکن قدرت کا یہ ایک عجیب کرشمہ ہے کہ ذوقِ سخن کا یہ آبائی دھارا ہمارے تمام خاندان کی کسی دوسری شاخ کی جانب نہیں مڑا، اور بخطِ مستقیم اسی شاخ کی جانب رواں رہا جس کا میں چوتھا رکن ہوں۔

اور یہ بھی عجیب سی بات ہے کہ میرے باپ کو، اور مجھے دادھیال ہی سے نہیں، نانہال کی طرف سے بھی شاعری کی وراثت ملی۔ میرے باپ کے ماموں تھے آگرے کے مشہور شاعر میرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبرآبادی، اور میرے ماموں تھے نواب رستم علی خاں سپہر، جو صرف شاعر ہی نہیں، ایک بہت بڑے عالم بھی تھے۔

ہم لوگوں میں اقتدار، دولت مندی اور شاعری کے اثرات کی بنا پر درسی تعلیم کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ ہم لوگ اپنے گھروں ہی پر مولویوں اور ماسٹروں سے تعلیم حاصل کرتے تھے، اور سب سے بری بات یہ تھی کہ ہمارے استاد ہم سے خوف زدہ رہتے تھے۔

خیر میں تو اپنے ماحول کی زنجیروں کو توڑ کر انگریزی مدارس میں داخل ہو گیا، اور اپنی زورازوری اور بالک ہٹ کی بنا پر تعلیم حاصل کرنے لگا۔ لیکن میرے بھائی مکتب سے باہر نہیں نکل سکے۔

اور جب لڑکوں کی تعلیم اس قابلِ افسوس حد تک ابتر تھی، تو آسانی کے ساتھ، اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میرے خاندان کے ماحول میں لڑکیوں کی تعلیم کی کس قدر بری حالت ہو گی۔

چناں چہ شمیم بھی، درسی نقطۂ نظر سے، اُسی زبوں ماحول کی پیداوار ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُس کے لہجے کا وقار، اُس کے الفاظ کی ترتیب اُس کے معانی کی درخشانی اور اُس کے اشعار کی شیرینی و روانی میں اس قدر تناسب و توازن ہے کہ کسی بڑی سے بڑی تعلیم یافتہ شاعرہ کا کلام

بھی اس سے بہتر نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔

شمیمؔ کا کلام بتاتا ہے کہ وہ ایک خالص ہندوستانی و پاکستانی خاتون ہے، اور اُس کے دل میں اُن جذبات کا فوّارہ چھوٹ رہا ہے جو مشرقی عورتوں کا ایک خاص طُرّۂ امتیاز ہوتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جہاں تک شاعری میں آزادانہ اظہارِ خیال کا تعلّق ہے، ہمارا ماحول نہایت تنگ و تار واقع ہوا ہے، اور ہماری عورتیں اسقدر جھجی ہوئی ہوتی ہیں کہ، شاعری کے میدان میں بھی، کُھل کر بات کرنا اُن کے واسطے مُشکل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی دُرُست ہے کہ شمیمؔ کو اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن اِس کے باوجود اُس کے وہاں یہ جھجکاؤ اس قدر کم ہے کہ اُسے "برائے نام" سے زیادہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

شمیمؔ کی نگاہ جس شاعرانہ انداز سے زندگی کے متعدد گوشوں کا اِحاطہ کرتی، جادۂ حیات کے موڑوں سے جس طرح گزرتی اور مڑتی ہے، اور لیل و نہار کی گردشوں سے جس طرح اثرات قبول کرتی اور ان اثرات کو آب دار اشعار کے سانچوں میں ڈھالتی ہے، ان سب باتوں پر نگاہ کر کے یہ بات، مُبالغے کے بغیر، اور، دعوے کے ساتھ، کہی جا سکتی ہے کہ خاکِ ہندوستان نے شمیمؔ کی سی شاعرہ کو اب تک پیدا نہیں کیا ہے، وہ آج بھی اُردو زبان کی تنہا شاعرہ ہے، اور ایک زمانۂ دراز تک تنہا شاعرہ کی حیثیت سے باقی رہے گی، اور شاعرات ہی تک یہ بات محدود نہیں، ہمارے مشہور شاعروں میں بھی ایسے شاعر کم ہیں، جنہیں شمیمؔ

کے مساوی مرتبہ دیا جا سکتا ہے۔

جوشؔ

۶-۱۲-۵۷
کراچی

"دیباچہ"

ایک دن سروجنی نائیڈو نے اقبال سے پوچھا۔ "کیا آپ نے کبھی میری نظمیں پڑھی ہیں؟ اگر ایسا اتفاق ہوا ہے۔ تو میں اپنی شاعری کے متعلق آپ کی رائے دریافت کرنا چاہتی ہوں"۔

علامہ نے فرمایا "جی ہاں۔ میں نے آپ کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی شاعری نہایت موزوں و مناسب ہے"

سروجنی یہ سُن کر متعجب ہوئیں۔ اور کہنے لگیں۔ "یہ موزوں و مناسب؟ کیا معنی؟"

علامہ نے فرمایا۔ "آپ عورت ہیں۔ اور آپ کی شاعری بھی "نسوانی" ہے۔ اس سے زیادہ مناسب و موزوں بات کیا ہوسکتی ہے؟"

علامہ نے ایک لفظ میں سروجنی کی شاعری کی لطافت۔ ان کے تخیل کی نزاکت۔ ان کے الفاظ کی خوشنمائی اور ان کے معانی کی سلاست کی طرف اشارہ کر دیا۔

میرے نزدیک صفیہ شمیم کی شاعری بھی بے حد "مناسب و موزوں" ہے۔

ہمارے نزدیک عورت اور خصوصاً مشرقی عورت کے کلام بلکہ اس کی طبیعت میں بھی نرمی اور ملائمت ضروری ہے۔ قول و فعل میں لطافت۔ ابلاغ و اظہار میں سادگی (قلن قولاً معروفاً)

زبان کی صحت اور محاورے کی درستی و پاکیزگی ہماری عورتوں کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ اُن کے احساسات غم کے ہوں یا خوشی کے۔ ہر حال میں متانت لیے ہوئے ہوتے ہیں اور بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ظاہر کئے جاتے ہیں۔

صفیہ شمیم کی نظموں میں آپ کو یہ تمام خصوصیتیں واضح طور پر نظر آئیں گی۔ پستی اور ابتذال کا کہیں نام نشان نہ ملے گا۔ کیونکہ عورت پستی اور ابتذال سے لازماً اور طبعاً بیگانہ ہوتی ہے۔

عورت چونکہ جذبات کو ہمیشہ حد سے بڑھے ہوئے ادراک پر فوقیت دینے کی عادی ہے۔ اسلیئے شمیم کا کلام مذہبیت۔ وطن دوستی۔ فطرت پسندی۔ محبت ہر چیز سے مملو ہے۔ وہ "وطنِ حال" کی خیر خواہی اور الفت میں "وطنِ قدیم" کو بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ صبح و شام کے دلفریب مناظر۔ تاروں بھری رات۔ نسیم سحر۔ رنگینی بہار۔ گل و گلزار کے ساتھ ساتھ دوپہر کی گرمی اور خزاں کی ویرانی سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ معاشرے کی خرابیوں۔ عوام کی مصیبتوں۔ اور مسائل وطن کی پیچیدگیوں سے بھی غافل نہیں۔ اس کے کلام میں جا بجا ان عمیق احساسات کا سراغ ملتا ہے۔ اور پکار پکار کر واضح کر رہا ہے۔ کہ شمیم کوئی معمولی "ناظمہ" نہیں۔ بلکہ حقیقی شاعرہ ہے۔

شما

آجکل دنیائے ادب میں نئے نئے تجربوں کا دور دورہ ہے۔ کہیں ابہام کی پرچھائیاں ہیں۔ کہیں ابلاغ و اظہار کی بے اعتدالیاں ہیں۔ کہیں پرانی ادبی روایات کا استخفاف ہے۔ قافیہ ردیف اور وزن و بحر سے "لہو و لعب" ہے۔ زبان و محاورہ سے بدسلوکی ہے۔ لیکن شمیم کا کلام ان تمام "تجاوزات و تجربات" سے پاک ہے۔ اس نے آجکل کے شعرا کو سیدھا راستہ دکھایا ہے جس پر چل کر وہ اپنے قومی ادب و شعر کی روایات حسنہ کو سلامت رکھتے ہوئے بیان و اظہار کے نئے نئے محاسن کی تخلیق بھی کر سکتے ہیں۔

اگر صفیہ شمیم اس مجموعے کو مرتب نہ کرتیں۔ تو یہ اردو کے ادب پر ظلم ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ ملک کے اہل سخن اور اہل فن اس مجموعے سے بے حد بہرہ اندوز حلاوت ہوں گے۔ اور ہمارے نقاد بھی ذرا آنکھیں کھول کر شمیم کے فن کی داد دیں گے۔

ارباب ذوق سلیم کو شمیم کے آئندہ مجموعے کا بیتابی سے انتظار رہے گا۔ کیونکہ ؎

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

مسلم ٹاؤن۔ لاہور

۲۱۔ دسمبر ۵۷ء

عبدالمجید سالک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام

(بحضورِ سرورِ کائنات)

السّلام اے تاجدارِ بزمِ امکاں السّلام

السّلام اے افتخارِ نوعِ انساں السّلام

السّلام اے محرمِ اسرارِ یزداں السّلام

السّلام اے نازشِ گردونِ گرداں السّلام

السّلام اے آفتابِ صبحِ ایماں السّلام

اے حقیقت آشنا، اے رازدارِ کائنات
فخرِ موجودات، نازِ سروری، رُوحِ حیات
اے مجسّم حُسن و خوبی، پیکرِ لُطف و عطا
پاک سیرت، پاک باطن، پاک طینت، پاک ذات
السلام اے آفتابِ صُبحِ ایماں السلام

جلوۂ صُبحِ حقیقت، اے حبیبِ کردگار
دولتِ ارض و سما، سرمایۂ صد افتخار
اے طبیبِ آدمیّت، مشعلِ رُوحانیت
تیرے ہر قول و عمل سے رحمتِ حق آشکار
السّلام اے آفتابِ صُبحِ ایماں السّلام

تابشِ صبحِ ازل، تابانیِ شامِ اَبد
شاہدِ حق، شمعِ عرفاں، نُورِ الہامِ اَبد
جلوۂ حُسنِ سعادت، پیکرِ پاکیزگی
تُو ہی آغازِ ازل ہے، تُو ہی انجامِ اَبد
السّلام اے آفتابِ صُبحِ ایماں السّلام

اے سراج الانبیا، شاہِ زماں، خیرالاَنام
پیکرِ صدق و صفا، ذی مرتبت، عالی مقام
فاتحِ سیلِ حوادث، تاجدارِ صُبح و شام
اے خدا کے آخری پیغامبر تُجھ پر سلام
السّلام اے آفتابِ صُبحِ ایماں السّلام

آسمانوں کا شرف اے رونقِ رُوئے زمیں

جلوۂ مہر و محبت، رحمتہ اللعالمیں،

وجہِ تخلیقِ دو عالم، خاصۂ پروردگار

جُھکتی ہے قدموں پہ تیرے خود فرشتوں کی جبیں

السلام اے آفتابِ صُبحِ ایماں السلام

راولپنڈی ۱۹۵۵ء

سلام

حسینؓ بے وطن و بے کفن سلام تجھے
سلام ساقیِ تشنہ دہن سلام تجھے
سلام قاسمِ گُل پیرہن سلام تجھے
نشاطِ قلبِ حسینؓ و حسنؓ سلام تجھے
سلام، شہ کے علمدار، ذی حشم عباسؓ
سلام نازشِ خیبر شکن سلام تجھے

سلام گلشنِ اسلام کے گلِ رعنا
سلام اکبرؓ شبیرؓ بن سخن سلام تجھے

سلام عابدؓ بیمار، بیکس و ناچار
اسیرِ حلقۂ رنج و محن سلام تجھے

سلام باغِ حسینی کے غنچۂ پامال
سلام اصغرؓ نازک بدن سلام تجھے

شہیدِ حق، شہ مظلوم، کشتۂ خنجر
حسینؓ اے شہِ خونیں کفن سلام تجھے

مٹا سکی نہ ترا رنگ و بُو ہوائے خزاں
سدا بہارِ علیؓ کے چمن سلام تجھے

ہزار کعبۂ دل تیری رہگذر پہ نثار
سلام قافلۂ پنجتن سلام تجھے

(راولپنڈی ۱۹۵۵ء)

ترانۂ وطن

ارضِ مشرق کا روشن ستارا ہے تُو
قلبِ گیتی کا رنگیں شرارا ہے تُو
اے کہ طُوفانِ غم کا کنارا ہے تُو
اے کہ ٹُوٹے دِلوں کا سہارا ہے تُو

اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قُرباں ستارے وطن

جگمگاتا ہوا شہرِ ارماں ہے تُو
مسکراتا ہوا شبنمستاں ہے تُو
لہلہاتا ہوا سنبلستاں ہے تُو
گُن گُناتا ہوا آبِ حَیواں ہے تُو

اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قُرباں ستارے وطن

اے طَربِ گاہِ گُل، کشورِ رنگ و بُو
دھوم تیری لطافت کی ہے کُو بکُو
تجھ سے تابندہ ہے محفلِ آرزو
تیرے ذرّوں میں ہے جذبِ دل کا لہو

اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قُرباں ستارے وطن

زندگانی ترے لالہ زاروں میں ہے
شادمانی ترے کوہساروں میں ہے
نوجوانی ترے خُلد زاروں میں ہے
سرخوشی تیری رنگیں بہاروں میں ہے

اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قُرباں ستارے وطن

اے کہ سرمایہِ دین و ملت ہے تُو
زندگی کی مقدّس امانت ہے تُو
ظُلمتِ غم میں نُورِ مسرّت ہے تُو
مُسکراتی ہوئی صُبحِ جنّت ہے تُو

اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قُرباں ستارے وطن

اے کہ رنگین خوابوں کا مسکن ہے تُو
آرزوؤں کا نوخیز گُلشن ہے تُو
اے کہ پھولوں سے لبریز دامن ہے تُو
ماہ و انجم کا زرّیں نشیمن ہے تُو

اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قُرباں ستارے وطن

عزمِ قائد کا تازہ فسانہ ہے تُو
قوم کے دل کا رنگیں ترانہ ہے تُو
شوق کا نعرۂ فاتحانہ ہے تُو
عدل و انصاف کا آستانہ ہے تُو

اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قُرباں ستارے وطن

تجھ میں غنچے بھی، تجھ میں شرارے بھی ہیں
تجھ میں طوفان بھی ہیں کنارے بھی ہیں
تیری آغوش میں غم کے مارے بھی ہیں
تیرے پہلو میں زر کے دُلارے بھی ہیں
اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قرباں ستارے وطن
تیرے گلشن میں خونِ لیاقت بھی ہے
تیرے غنچوں میں بُوئے محبّت بھی ہے
تیرے ہاتھوں میں شمشیرِ غیرت بھی ہے
تیرے دِل میں غمِ آدمیت بھی ہے
اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قرباں ستارے وطن

نشان اپنی وفا کی دِکھا دیں گے ہم
تیری عزّت پہ سر کو کٹا دیں گے ہم
تیرے قدموں پہ جانیں لُٹا دیں گے ہم
دُھوم تیری جہاں میں مچا دیں گے ہم
اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قرباں ستارے وطن

تُجھ میں تابندہ ہے نقشِ اقبال بھی
سازِ پنجاب بھی، سحرِ بنگال بھی
حُسنِ کشمیر بھی، جوشِ چترال بھی
شانِ ماضی بھی ہے، دولتِ حال بھی
اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قرباں ستارے وطن

عزمِ محکم کی اے یادگارِ حسیں
آسمانوں پہ خنداں تری سرزمیں
تجھ سے تابندہ انوارِ صبحِ یقیں
تیرے قدموں میں ہیں تخت و تاج و نگیں

اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قرباں ستارے وطن

تیری ہر صبح آئینہ دارِ علیؓ
تیرا ہر پھول ہے یادگارِ علیؓ
اے فدائے نبیؐ، اے نثارِ علیؓ
تجھ پہ سایہ فگن ذوالفقارِ علیؓ

اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قرباں ستارے وطن

تیرے گیسو ہمیشہ مہکتے رہیں
تیرے عارض ہمیشہ دمکتے رہیں
تیرے ساغر ہمیشہ چھلکتے رہیں
تیرے تارے ہمیشہ چمکتے رہیں
اے وطن زندگی کے سہارے وطن
تیرے ذرّوں پہ قرباں ستارے وطن

راولپنڈی ۱۹۵۷ء

میرے نغمے

میرے نغمے، لالہ زاروں کا شبابِ احمریں
میرے نغمے، آبشاروں کا ربابِ دل نشیں
میرے نغمے، تازہ کلیوں کا کلامِ دل رُبا
میرے نغمے، ظُلمتوں میں چشمۂ آبِ بقا
میرے نغمے، شبنم و گُل کی تمثیلی داستاں
میرے نغمے، باغِ ہستی میں بہارِ گُل فشاں
میرے نغمے، لیلیٰ احساس کا عکسِ جمیل
میرے نغمے، سینۂ ظُلمت میں موجِ سلسبیل

میرے نغمے، زندگی کے نو بنو نقش و نگار

میرے نغمے، جلوۂ کونین کے آئینہ دار

میرے نغمے، گُن گُناتی ندیوں کا پیچ و خم

میرے نغمے، آبشارِ زندگی کا زیر و بم

میرے نغمے، درد میں ڈوبی نوائے زندگی

میرے نغمے، صبح کو بادِ صبا کی راگنی

میرے نغمے، غمزدہ انسانیت کے رازداں

میرے نغمے، سینۂ افلاس سے اُٹھتا دھواں

میرے نغمے، حُسن کے خالق، محبت کے امیں

میرے نغمے، دیدۂ افلاک کے خوابِ حسیں

میرے نغمے، فکر کی ضَو، قلب کا سوز و گداز

میرے نغمے، عشق کی لَے، زہرۂ فطرت کا ساز

میرے نغمے، غم زدہ ٹوٹے دِلوں کے غمگُسار

میرے نغمے، گُلستانِ آدمیت کا نکھار

میرے نغمے، خندۂ گُل، نکہتِ بادِ صَبا

میرے نغمے، مسکراتے چاند تاروں کی ضِیا

میرے نغمے، برق و شبنم کا انوکھا اِمتزاج

حُسن کے دُربار جُھومر، عشق کے گُلرنگ تاج

میرے نغمے، آنسوؤں کے جِھلملاتے ہار ہیں

میرے نغمے، سازِ دِل کی گونجتی جھنکار ہیں

راولپنڈی ۱۹۵۷ء

رخصت

یونہیں اس فضا میں ترانے رہیں گے
چمن میں گلوں کے فسانے رہیں گے
فسانوں میں غلطاں زمانے رہیں گے

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم
نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یہی رُوح پرور نظارے رہیں گے
یونہیں رقص میں چاند تارے رہیں گے
بہم چشمکیں اور اشارے رہیں گے

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم
نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یہی گل بداماں فضائیں رہیں گی
یونہیں گوہر افشاں گھٹائیں رہیں گی
یہی رُوح پرور ہوائیں رہیں گی

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم
نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یہی جلوۂ شبنمستاں رہے گا

یہی کیفِ شعر و شبستاں رہے گا

یونہیں وجد میں سنبلستاں رہے گا

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بُھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یہی نازِ فصلِ بہاراں رہے گا

یہی سازِ طرفِ گُلستاں رہے گا

یہی شادمانی کا عُنواں رہے گا

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بُھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یہاں فصلِ گُل روز آتی رہے گی

گمِ بیاں کے پُرزے اُڑاتی رہے گی

تمنّا کے گھونگٹ اُٹھاتی رہے گی

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھُولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یُونہیں صبح سے شام ملتی رہے گی

کلی شادمانی کی کھلتی رہے گی

قبائے زندگانی کی سِلتی رہے گی

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھُولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

فروزاں فروزاں دبستاں رہے گا

درخشاں درخشاں گلستاں رہے گا

چراغاں چراغاں شبستاں رہے گا

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یونہیں بڑھتے گھٹتے رہیں گے اندھیرے

یونہیں مسکرائیں گے دلکش سویرے

پڑیں گے یونہیں لالہ و گل کے ڈیرے

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یونہیں شادمانیٔ گل افشاں رہے گی
یونہیں شمعِ ہستی فروزاں رہے گی
یونہیں روحِ عشرت غزلخواں رہے گی

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم
نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یونہیں باغ کروٹ بدلتے رہیں گے
یونہیں دورِ عشرت کے چلتے رہیں گے
یونہیں بول گیتوں میں ڈھلتے رہیں گے

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم
نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یونہیں زلفِ گیتی بکھرتی رہے گی
بکھرتی رہے گی سنورتی رہے گی
سنورتی رہے گی نکھرتی رہے گی

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم
نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

نئے کارواں روز آتے رہیں گے
پرانی زمیں کو بساتے رہیں گے
ستارے یہی جگمگاتے رہیں گے

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم
نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

جنوں کی فضائیں ہیں کتنی سہانی

بھڑکتی ہے آگ اور مچلتا ہے پانی

جھلکتے ہیں رہ رہ کے خوابِ جوانی

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یونہیں روز سنکیں گی پیہم ہوائیں

مہکتی رہیں گی دما دم فضائیں

برستی رہیں گی جھما جھم گھٹائیں

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یہی جنگِ خورشید و شبنم رہے گی

یہی کاوشِ فکرِ آدم رہے گی

یہی گرمیِ روحِ عالم رہے گی

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یونہیں رات فرقت کی ڈھلتی رہے گی

یونہیں صبح پہلو بدلتی رہے گی

شگوفوں پہ شبنم مچلتی رہے گی

یہاں سے مگر یوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یُونہیں رات پائل بجاتی رہے گی

نشیلی فضا کو نچاتی رہے گی

یُونہیں زندگی مُسکراتی رہے گی

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھُولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یہی کیفِ حرف و حکایت رہے گا

یہی ربطِ حُسن و محبّت رہے گا

یہی لطفِ شکر و شکایت رہے گا

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھُولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یہ مانا بہت دِل نشیں ہے یہ دُنیا

محبت کی خُلدِ بریں ہے یہ دُنیا

جوانی کا خوابِ حسیں ہے یہ دُنیا

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بُھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

کھڑی ہوں گی ساون کی یُونہیں قناتیں

گھٹاؤں کی نکلیں گی یُونہیں براتیں

یُونہیں پی کی جُھولے میں جُھولیں گی باتیں

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بُھولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

مہکتے رہیں گے جوانوں کے سہرے

کہیں پھول ڈُھرے کہیں پھول تہرے

جھمکتے رہیں گے عروسوں کے چہرے

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھُولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یونہیں آئیں گی لوریوں کی صدائیں

لگائیں گی سینے سے بچّوں کو مائیں

سروں پر برستی رہیں گی دُعائیں

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھُولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

یونہیں چاندراتیں بھی آتی رہیں گی

دِلوں میں دیئے سے جَلاتی رہیں گی

کسی کو کسی سے مِلاتی رہیں گی

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھُولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

پُکاریں گی ہم کو سُہانی فضائیں

بُلائیں گی ہم کو مہکتی ہوائیں

صَدا دیں گی ہم کو برستی گھٹائیں

یہاں سے مگر یُوں چلے جائیں گے ہم

نہ بھُولے سے بھی پھر کبھی آئیں گے ہم

راولپنڈی ۱۹۵۶ء

دِل

قیامت کا اضداد ساماں ہے دِل

گہے درد ہے، گاہ درماں ہے دِل

گہے سیل در سیل مثلِ سراب

گہے موج در موج طوفاں ہے دِل

کبھی کفش بردارِ بادِ خزاں

کبھی شہر یارِ بہاراں ہے دِل

کبھی نالۂ شامِ افسردگی
کبھی نغمۂ صبحِ خنداں ہے دِل

کبھی منعم و وارثِ کائنات
کبھی مفلس و تنگ داماں ہے دِل

کبھی بر بطِ عیش سے مضطرب
کبھی سازِ غم پر غزلخواں ہے دِل

کبھی مرکبِ ذرّہ و خشت و سنگ
کبھی راکبِ مہرِ تاباں ہے دِل

کبھی صبحِ ہنگامۂ زندگی
کبھی شامِ گورِ غریباں ہے دِل

کبھی پیکرِ یاس و حرمان و غم
کبھی رشکِ سروِ خراماں ہے دِل

خِرد کا کبھی خسروِ کارساز
جُنوں کا کبھی میرِ ساماں ہے دِل

کبھی صَرصَرِ دشت و بادِ سَمُوم
کبھی مشعلِ خضرِ دَوراں ہے دِل

کبھی شَررِ بدوش، اور کبھی بَرِ گُل
گہے اہرمن، گاہ یزداں ہے دِل

گہے مرگِ اندوہ و آشفتگی
کبھی چشمۂ آبِ حیواں ہے دِل

کبھی صحنِ گیتی میں دریوزہ گر
کبھی بامِ گردوں پہ سلطاں ہے دِل
معمّا ہے جس کا نہیں حل کوئی
بدستور اک رازِ پنہاں ہے دِل

راولپنڈی ۱۹۵۳ء

محبّت

آبشاروں کا نغمۂ پیہم
کوہساروں کا جذبۂ محکم
رُوئے حُورانِ خُلد کا پَرتَو
گُلستاں میں چراغِ گُل کی لَو
لالہ زارِ شفق کی صبحِ حسیں
گُلستاں میں بہار کا آئیں

دامنِ گُل پہ گوہرِ شبنم

قلبِ گیتی کی جُنبشِ پیہم

وادیِ خُلد کی حسین سحر

جادۂ شب پہ کاروانِ قمر

قدسیوں کا تبسّمِ رنگیں

موجِ کوثر کا نغمۂ شیریں

عارضِ گُل پہ صبحِ نَو کی کرن

نو عروسِ بہار کا دامن

شاخِ گُل کی لچک، صبا کا خرام

تازہ کلیوں کا دلفروز کلام

لالہ و گل کی دل رُبا شوخی

تابِ قوس و قزح کی رنگینی

خُلد زاروں میں رنگ و بُو کا ہجوم

ظُلمتِ شب میں رقصِ ماہ و نجوم

بحرِ ہستی کی موجِ بے پایاں

بارشِ نُور، جلوۂ یزداں

بادۂ آگہی، بہشتِ خیال

رُوح کا حُسن، زندگی کا جمال

جلوۂ سادہ، جذبۂ معصوم

دل میں رقصاں، نگاہ سے معدوم

قلبِ فطرت کا نغمۂ ابدی

زندگانی کا جلوۂ ازلی

گلشنِ دل پہ بارشِ الہام

سازِ خاموش، بے صدا پیغام

رُوحِ پیغمبری، دِلِ جبریلؑ

شوق کی صبح حسن کی قندیل

راولپنڈی ۱۹۵۶ء

یومِ جمہوریہ پاکستان

(یہ نظم تیئیسویں مارچ ۱۹۵۶ء کو جشنِ جمہوریہ پاکستان کے سلسلے میں ایک مشاعرے کیلئے لکھی گئی تھی)

اُفقِ اشک سے پھوٹی ہے کرن آج کے دِن

مسکراتے ہیں اُمیدوں کے چمن آج کے دِن

لے کے آئی ہے صبا بوئے سمن آج کے دِن

جاگ اُٹھی آرزوئے دشت و چمن آج کے دِن

اِک نئی صُبحِ بہاراں کی خبر دیتا ہے
مسکراتا ہوا ہر خارِ چمن آج کے دِن

اِک نئے موڑ پہ ہے قافلۂ اہلِ جُنوں
بَدلا بَدلا ہے زمانے کا چلَن آج کے دِن

اِس قدر دھیان رہے ساقیِ بزمِ جمہُور
کوئی باقی نہ رہے تشنہ دہن آج کے دِن

پھُول تو پھُول ہیں کانٹوں میں بھی ہے بُوئے وفا
شاد ہے رُوحِ شہیدانِ وطن آج کے دِن

شکوہ سنجانِ قفس سے کوئی جا کر کہہ دے
کٹ گیا سِلسلۂ دار و رسن آج کے دِن

نوعِ انساں پہ کھلا آج درِ امن واماں

ہل گئی ظلم کی بنیادِ کہن آج کے دن

اِک نئی رَو ہے، نئی دھن ہے نیا ذوقِ عمل

جاگ اٹھا عزمِ محبانِ وطن آج کے دن

آج برسائی ہے گلشن پہ بہاروں نے شراب

لالہ گوں ہے رخِ زیبائے وطن آج کے دن

شوخیاں اتنی بھی اچھی نہیں اے بادِ صبا!

لَو کہیں دے نہ اٹھے داغِ کہن آج کے دن

راولپنڈی ۱۹۵۶ء

جادۂ بے منزل

لبِ گُل پہ دوزخ کی تپتی کہانی
مہکتے شگوفوں پہ آتش فشانی
ہر اک گام پر آفتِ ناگہانی
لئے جا رہی ہے کِدھر زندگانی

ہر اک شکل ہر اک نظر اجنبی ہے
ہر اک جادہ، ہر رہگذر اجنبی ہے
ہر اک شام، ہر اک سحر اجنبی ہے
لئے جا رہی ہے کِدھر زندگانی

ہر اک گام پہ منتظر ہے تباہی
سیاہی پہ چھائی ہوئی ہے سیاہی
شبِ غم کی دیتے ہیں تارے گواہی

لئے جا رہی ہے کدھر زندگانی

نہ صحرا، نہ ناقہ، نہ لیلیٰ، نہ محمل،

نہ رہبر، نہ ہادی، نہ جادہ، نہ منزل
ٹھہرنا بھی مشکل، گزرنا بھی مشکل

لئے جا رہی ہے کدھر زندگانی

نہ ہمراز کوئی نہ فریاد رس ہے

نہ بانگِ درا ہے، نہ بانگِ جرس ہے

ہر اک گام پر عقل کو پیش و پس ہے

لئے جا رہی ہے کدھر زندگانی

کہیں عشق کی آبرو لُٹ رہی ہے
کہیں دولتِ ننگ و بُو لُٹ رہی ہے
کہیں محفلِ آرزو لُٹ رہی ہے

لئے جا رہی ہے کدھر زندگانی

نہ ہے خیمۂ گُل، نہ ابرِ بہاراں
نہ سازِ تمنّا، نہ بانگِ ہزاراں
نہ آغوشِ گلشن، نہ شمعِ شبستاں

لئے جا رہی ہے کدھر زندگانی

نکلتے ہیں سرو و سمن سے شرارے
اندھیرے میں شب کی بھٹکتے ہیں تارے
لرزتے ہیں قصرِ فلک کے منارے

لئے جا رہی ہے کدھر زندگانی

ہر اک گام پر آفتِ ناگہاں ہے

فضاؤں میں گونجی صدائے فغاں ہے

زمیں سے فلک تک دُھواں ہی دُھواں ہے

لیئے جارہی ہے کدھر زندگانی

دنارت کہیں سر اُٹھائے ہوئے ہے

صداقت کہیں زخم کھائے ہوئے ہے

حقیقت کہیں مُنہ چھپائے ہوئے ہے

لیئے جارہی ہے کدھر زندگانی

شقاوت کہیں آگ برسا رہی ہے

کدُورت کہیں دام پھیلا رہی ہے

محبت کہیں اشک ٹپکا رہی ہے

لیئے جارہی ہے کدھر زندگانی

قیامت کا ہے رہگذر میں اندھیرا
اندھیرے میں پھرتا ہے خُونی لُٹیرا
ہر اک راہ میں ہے فلاکت کا ڈیرا

لئے جا رہی ہے کِدھر زندگانی

کہیں عظمتِ زندگی لُٹ رہی ہے
گلُوں کی کہیں تازگی لُٹ رہی ہے
کہیں دولتِ آگہی لُٹ رہی ہے

لئے جا رہی ہے کِدھر زندگانی

گھٹائیں کہیں خُون برسا رہی ہیں
ہوائیں کہیں آگ بھڑکا رہی ہیں
فضائیں عجب رنگ دِکھلا رہی ہیں

لئے جا رہی ہے کِدھر زندگانی

غمِ دہر اُلٹے ہوئے آستیں ہے

ہر اِک شام، ہر اِک سحر آتشیں ہے

فلک ایک شعلہ ہے طوفاں زمیں ہے

لئے جا رہی ہے کدھر زندگانی

راولپنڈی ۱۹۵۴ء

رخصتِ بہار

برکھا زمیں کا حُسن بڑھا کر چلی گئی

دُنیائے آب و گِل کو جگا کر چلی گئی

گُلہائے رنگ رنگ کِھلا کر چلی گئی

لَو شمعِ زندگی کی بڑھا کر چلی گئی

طُوفان آنسوؤں کے اُٹھا کر چلی گئی

بُجھتے دِلوں میں آگ لگا کر چلی گئی

کوئل کی لَے کو بخش کے سوز و گدازِ غم

خوابیدہ زمزموں کو جگا کر چلی گئی

ہر غنچہ زر نگار ہے، ہر خار تابدار

دُنیا کو نو عروس بنا کر چلی گئی

صحرا ہیں موتیوں کے جزیرے بنے ہوئے

گُل ریز وادیوں کو ہنسا کر چلی گئی

نغمے روش روش ہیں، ترانے چمن چمن

لَے سازِ زندگی کی بڑھا کر چلی گئی

گویا چمن کو عرشِ بریں پر بٹھا گئی

خلعت گُلوں کو ایسے پنہا کر چلی گئی

روشن ہے جن کی یاد سے دُنیائے زندگی

ماضی کے ایسے خواب دِکھا کر چلی گئی

گُل ہنس دیئے گھٹائیں جھکیں اور برس پڑیں

موتی چمن چمن میں لُٹا کر چلی گئی

مُرغانِ گُلستاں کو چہکنے سے کام ہے

ایسی خوشی کی لہر اُٹھا کر چلی گئی

گلزار و کوہ و دشت میں یکساں بہار ہے

خوشبو کے ایسے دام بچھا کر چلی گئی

درسِ نشاط دے گئی افسردہ دہر کو

طوفاں مسرّتوں کے اُٹھا کر چلی گئی

برسا گئی شرابِ تبسّم چمن چمن
ہر دشت ہر چمن کو جگا کر چلی گئی

۱۹۴۰ء

دردِ نغمہ

رات کی خاموشیوں میں دھیمی دھیمی غم فزا
آ رہی ہے اِک عجب پُر درد نغمے کی صدا
کانپ کانپ اُٹھتا ہے دل وہ سوز ہے وہ ساز ہے
ذرّہ ذرّہ گلستاں کا گوش بر آواز ہے
آ رہی ہے یوں صدا رُوحوں کو تڑپاتی ہوئی
آتشِ سوزِ وفا سینوں میں بھڑکاتی ہوئی

اشک آنکھوں میں بناتی دل کو تڑپاتی ہوئی
رات کی خاموشیوں میں آفتیں ڈھاتی ہوئی
سوز میں ڈوبی ہوئی، سینوں میں غم بنتی ہوئی
خنجرِ آلام و پیکانِ ستم بنتی ہوئی
غم فزا، پُر درد احساسات میں ڈوبی ہوئی
رُوح فرسا، دِل شکن جذبات میں ڈوبی ہوئی
کس نے چھیڑا نغمۂ غم دِل ہلانے کے لئے
میری دُنیائے غم و حسرت جگانے کے لئے
یادِ ماضی قلبِ محزوں کو رلانے کے لئے
زندگی کو عالمِ غمگیں بنانے کے لئے
گا رہا ہے کون یہ، ناشاد کرنے کے لئے
عالمِ تسکینِ دِل برباد کرنے کے لئے

۱۹۳۷ء

تلاشِ سحر

اُٹھو کہ شب میں جمالِ سحر تلاش کریں
ہجومِ خار میں گُل ہائے تر تلاش کریں
شبِ فراق میں روشن کریں چراغِ مُراد
اُٹھو تجلّیِ قلب و نظر تلاش کریں
لوائے ابر میں ڈھونڈیں فروغِ شمس و قمر
ردائے خاک میں لعل و گہر تلاش کریں

اٹھو سُراغ لگائیں جہانِ ماضی کا
اٹھو امانتِ شام و سحر تلاش کریں

چمن اُداس ہے، گُل سرنگوں، فضا خاموش
اٹھو سرورِ نسیمِ سحر تلاش کریں

فضا پہ موت کا چھایا ہوا ہے سناٹا
اٹھو کہ ولولۂ بحر و بَر تلاش کریں

سکونِ شبنم و یخ کی فتادگی تا چند
اٹھو تلاطمِ برق و شرر تلاش کریں

نیاز و ناز کے تازہ کریں پھر افسانے
بہ ذوقِ عجز کوئی سنگِ دَر تلاش کریں

حریمِ فکر کے سب جھلملا رہے ہیں چراغ
اٹھو تجلیِ شمس و قمر تلاش کریں

خروشِ عزمِ سفر پھر جواں کریں دل میں
غبارِ راہ میں پھر راہبر تلاش کریں

ربابِ وقت پہ چھیڑیں ترانۂ اَبدی
دیارِ مرگ میں عُمرِ خضر تلاش کریں

فضا کے دوش پہ لہرائیں پرچمِ عظمت
شکستِ غم میں نشاطِ ظفر تلاش کریں

گھُٹی گھُٹی سی فضا ہے دیارِ ہستی کی
اٹھو سعادتِ نوعِ بشر تلاش کریں

توہمات کی پُرہول بدلیوں میں شمیمؔ
اٹھو حقائقِ نورِ سحر تلاش کریں

۱۹۵۰ء

نامُمکنات

جیسے پتھر کو کوئی ہیرا بنا سکتا نہیں

جیسے کانٹا صُورتِ گُل مُسکرا سکتا نہیں

جیسے شبنم کو کوئی موتی بنا سکتا نہیں

جس طرح کوئی سمندر کو سُکھا سکتا نہیں

جیسے ناممکن ہے انگاروں کا بن جانا گلاب

جیسے کوئی زہر کو اَمرت بنا سکتا نہیں

جیسے چل سکتا نہیں بس زندگی کا موت پر

جیسے لکھا کوئی قسمت کا مٹا سکتا نہیں

چھیننا جس طرح ناممکن ہے گرمی آگ سے

جیسے کوئی آگ پانی میں لگا سکتا نہیں

جیسے ناممکن ہے سورج کا نکلنا رات کو

جس طرح دن شب کی سی ظلمت دکھا سکتا نہیں

جیسے بہکا ہی نہیں سکتا فرشتوں کو کوئی

جس طرح کوئی "خدا کیا ہے" بتا سکتا نہیں

جیسے دن کو دے نہیں سکتے ستارے روشنی

جیسے کوئی وسعتِ گردوں کو پا سکتا نہیں

جیسے کوئی قید کر سکتا نہیں مہتاب کو

جیسے کوئی آسماں کا سر جھکا سکتا نہیں

جیسے طوفاں میں بڑھا سکتا نہیں کشتی کوئی

جیسے آندھی میں کوئی مشعل جلا سکتا نہیں

جس طرح ہے تم کو میرا یاد کر لینا محال

دل مرا یونہی کبھی تم کو بھلا سکتا نہیں

ساون

گلشن کو خلعتِ گُل پہنا رہا ہے ساون

ساغر حیاتِ نَو کے چھلکا رہا ہے ساون

کلیوں کو مُسکرانا سکھلا رہا ہے ساون

باغوں میں ہیں ترانے، ندیوں پہ ہیں مَلاریں

یادوں کا ہے ترشح نغموں کی ہیں پُھواریں

غُل ہے چمن چمن میں پھر آرہا ہے ساون

ہر دشت، ہر بیابان، ہر کوہ، ہر دمن پر
شاداب وادیوں پر، ہر باغ، ہر چمن پر
پرچم بہارِ نو کا لہرا رہا ہے ساون

بادل برس برس کر پہلو بدل رہے ہیں
دریا اُبل اُبل کر ہر سُو مچل رہے ہیں
گُل رنگ وادیوں کو نہلا رہا ہے ساون

بھیگی ہوئی فضا میں، مہکی ہوئی ہوا میں
مہکی ہوئی ہوا میں، اُمڈی ہوئی گھٹا میں
بل کھا رہا ہے ساون، لہرا رہا ہے ساون

ہر سمت بوندیوں کی چھاگل بجا بجا کر
چھاگل بجا بجا کر، نغمے جگا جگا کر
ارض و سما کے دل کو تڑپا رہا ہے ساون

ہر اک کلی تبسّم، ہر غنچہ ضَو فشاں ہے
ہر اک روش فروزاں، ہر راہ کہکشاں ہے
تاروں کی انجمن کو شرما رہا ہے ساون

نکھری ہوئی زمیں ہے، بِچھلا ہوا فلک ہے
پھولی ہوئی شفق ہے، ہنستی ہوئی دھنک ہے
گلشن میں آتشِ گُل بھڑکا رہا ہے ساون

ہر ساز دل رُبا ہے، ہر نغمہ دلستاں ہے

ہر پھول ہے غزلخواں، ہر خار داستاں ہے،

بُوندوں کو گنگنانا سکھلا رہا ہے ساون

۱۹۵۵ء

برسات

اے زمیں کی مسکراہٹ، آسماں کی دلکشی

بوستانوں کی تمنّا، جنگلوں کی تازگی

رقص و نغمہ، شادمانی، کیف و مستی، راگنی

سینۂ گیتی کا ارماں، آرزوئے زندگی

زمزموں کی شاہزادی، جنّتوں کی حورِ عیں

اے طلسمِ سِحرِ خوشی، اے نو عروسِ مہ جبیں

اے شبابِ آب و گِل، اے آب و تابِ زندگی

اے سراپا کیف و مستی، اے نشاطِ نغمگی،

نورِ گلشن، زیورِ گل، نازشِ بُستاں ہے تو

کاکُلِ فطرت کی یا چھوٹی ہوئی افشاں ہے، تو

اے نگارِ گُل بہ دامن زہرۂ ناز آفریں

تیرے نغموں کی بدولت لعل اُگلتی ہے زمیں

اے جہاں دارِ طرب، سر مستیٔ موجِ شراب

اے نویدِ سرخوشی، سرشاریٔ حُسن و شباب

دستِ فطرت میں چھلکتا ساغرِ عشرت ہے، تو

رنگ بیزِ عیش ہے، سرمایۂ راحت ہے تو

نرم کلیوں کا تبسّم، شوخ پھُولوں کا غرور

موجِ جاں افروز، موجِ رنگ و بو، موجِ سرور

اے نگارِ گُل فشاں، اے شاہدِ گلگوں عذار

غازۂ روئے چمن، آرائشِ لیل و نہار

لیلیٰ فطرت کے سینے کا دھڑکتا دِل ہے تُو

ارتقائے زندگی ہے رُوحِ آب و گِل ہے تُو

گُلشنِ فردوس کا بھٹکا ہوا نغمہ ہے تُو

سینۂ آفاق سے پھوٹا ہوا چشمہ ہے تُو

شملہ ۱۹۴۴ء

نذرِ قائدِ اعظم

سلام تجھ کو ہر اک لالہ زار کہتا ہے
سلام تجھ کو ہر اک دِل فگار کہتا ہے
سلام تجھ کو ہر اک سوگوار کہتا ہے
سلام بانیِ ارضِ وطن سلام تجھے

تجھی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں تیرے دیوانے
تری ہی شمعِ محبت کے ہیں یہ پروانے
دِلوں پہ نقش ہیں تیری وفا کے افسانے
سلام بانیِ ارضِ وطن سلام تجھے

ترے خیال کی جنت بسائے بیٹھے ہیں
تری ہی یاد کی شمعیں جلائے بیٹھے ہیں
تری ہی راہ میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں
سلام بانیِ ارضِ وطن سلام تجھے

تری عزیز امانت کے پاسباں ہیں ہم

ترے ہی نقشِ قدم پر رواں دواں ہیں ہم

ہر ایک دشت و دمن میں گہر فشاں ہیں ہم

سلام بانیِ ارضِ وطن سلام تجھے

ترے ہی عزم سے ہر عزم ہے جواں اپنا

ترے یقیں نے بدلا ہے ہر گماں اپنا

ترے چراغ سے روشن ہے آشیاں اپنا

سلام بانیِ ارضِ وطن سلام تجھے

ہر ایک ذرّے کو عالم بنا دیا تو نے

ہر ایک شعلے کو شبنم بنا دیا تو نے

ہر ایک زخم کو مرہم بنا دیا تو نے

سلام بانیِ ارضِ وطن سلام تجھے

نہ ہو سکے گی کبھی روحِ زندگی مایوس

نہ لٹ سکے گا کبھی بزمِ عشق کا ناموس

نہ بجھ سکیں گے جلاتے ہوئے ترے فانوس

سلام بانیِ ارضِ وطن سلام تجھے

عمرِ گریزاں ٹھہر جا

ابھی غنچۂ فہم مہکا نہیں ہے

ابھی باغِ ادراک لہکا نہیں ہے

ابھی گلشنِ فکر دہکا نہیں ہے

ابھی اور عمرِ گریزاں ٹھہر جا

ابھی رازدارِ دو عالم نہیں دل

جو گُل پر ہو وہ اشکِ شبنم نہیں دل

ابھی فاتحِ شادی و غم نہیں دل

ابھی اور عُمرِ گریزاں ٹھہر جا

ابھی مُطربِ شوق لہکا نہیں ہے

ابھی طائرِ فکر چہکا نہیں ہے

ابھی گُلشنِ عشق مہکا نہیں ہے

ابھی اور عمرِ گریزاں ٹھہر جا

حقائق ہیں انساں سے اب تک گریزاں
ابھی رہنِ ظلمات ہے آبِ حیواں
ابھی دور ہے قصرِ تکمیلِ انساں
ابھی اور عمرِ گریزاں ٹھہر جا

ابھی بسترِ خاک پر زندگی ہے
ہلاکِ فریبِ نظر زندگی ہے
گرفتارِ خوف و خطر زندگی ہے
ابھی اور عمرِ گریزاں ٹھہر جا

ابھی دردِ ممنونِ درماں نہیں ہے

ابھی دولتِ عیش ارزاں نہیں ہے

ابھی قصرِ امید تاباں نہیں ہے

ابھی اور عمرِ گریزاں ٹھہر جا

ابھی زندگی غافل و بے خبر ہے

ابھی فکر گم ہے، پریشاں نظر ہے

ابھی رات کو انتظارِ سحر ہے

ابھی اور عمرِ گریزاں ٹھہر جا

ابھی فطرتِ آب و گِل تولنا ہے

چٹانوں پہ لعل و گہر رولنا ہے

ابھی قفلِ ارض و سما کھولنا ہے

ابھی اور عمرِ گریزاں ٹھہر جا

راولپنڈی ۔ ۱۹۵۰ء

صبحِ بہار

ضو فشاں ہے چمن میں صبحِ بہار
ذرہ ذرہ ہے رشکِ روئے نگار
جگمگاتے ہوئے یہ غنچہ و گل
لہلہاتے ہوئے یہ سرو و چنار
عارضِ شام پر یہ رنگِ شفق
صبح کے رُخ پہ نَو بنَو انوار

یہ سسکتی ہوا لبِ دریا

یہ بھٹکتی صبا سرِ کہسار

قلبِ شاعر کا حُسنِ لامحدود

کاہ سے ضوفشاں ہے تا کہسار

یہ بکھرتی چمن چمن زُلفیں

یہ جھلکتے روش روش رخسار

آبشاروں کے نرم تاروں سے

روحِ ارض و سما ہے زمزمہ بار

موجۂ رُودِ گنگ ہے جَولاں

لیلیِٰ آب و رنگ ہے بیدار

یہ ہوا میں ہے رَو ترنّم کی
دُور جس طرح بج رہا ہو سِتار

بوندیاں پرفشاں ہیں کلیوں پر
اور یہاں چشمِ تر ہے گوہر بار

کس سے پوچھوں کہ کس جگہ جا کر
سوگئی ہے مرے چمن کی بہار

راولپنڈی ۱۹۴۸ء

شام کے ستارے سے

اے شام کے ستارے، اے آسماں کی زینت
تیری ضیا سے دل کو حاصل ہے نور و فرحت
اللہ رے تابناکی، اے مشعلِ درخشاں
ہے تیرے دم سے روشن لیلائے شب کا ایواں
اے مظہر تجلّی یہ آب و تاب تیری
بے پردگی ہے تیری خود ہی نقاب تیری

اے جلوۂ حقیقت، اے پرتوِ سعادت

عرشِ بریں کی رونق، فانوسِ بزمِ فطرت

اے رفعتِ فلک کو ارفع بنانے والے

اپنی جھلک دکھا کر، اے مسکرانے والے

کچھ تو بتا دے حالت چھوٹے ہوئے وطن کی

جیسی تھی کیا ہے اب بھی رونق وہی چمن کی

گلزار میرے گھر کا ویران تو نہیں ہے

میرے لئے مرا گھر حیران تو نہیں ہے

کیا چھیڑتے ہیں اب بھی مطرب وہاں ترانے

کیا لوٹتے ہیں دل کو اب تک وہی فسانے

میرے چمن کے غنچے کمھلائے تو نہیں ہیں

گُل ہائے باغِ عشرت مُرجھائے تو نہیں ہیں

کیا گرمیوں کی رُت میں کھلتے ہیں پھول ہر سُو

آتی ہے، ہلکی ہلکی بیلے کی مست خوشبو

کیا آسماں پہ اب بھی آتے ہیں مست بادل

اب بھی اُسی اَدا سے کیا جھومتے ہیں جنگل

دیہاتیوں کے شب کو چھڑتے ہیں راگ اب بھی

پھولوں کو چومتی ہے اب بھی سحر کی خُنکی

آتا ہے شب کو لشکر کیا اب بھی بادلوں کا

کیا بولتا ہے اب بھی پچھلے پہر پپیہا!

کرتے ہیں اب بھی روشن شب کو چراغ جگنو

کیا کوکتی ہے کوئل پیڑوں پہ اب بھی ہر سُو

پھولوں کو شوخ کرنیں کیا اب بھی چومتی ہیں

مستانہ وار شاخیں کیا اب بھی جھومتی ہیں

کیا چھیڑتی ہے شبنم کلیوں کو صبح ہوتے

گاتی ہیں اب بھی چڑیاں شاخوں پہ ساتھ مل کے

شامِ اودھ کے رُخ پر شیریں بنیاں وہی ہیں

شیریں بنیاں وہی ہیں رنگینیاں وہی ہیں

ہوتا ہے ذکر میرا کیا اب بھی انجمن میں

مغموم تو نہیں ہیں ہم جولیاں وطن میں

اب بھی طرب فزا ہیں میرے وطن کی راتیں
کیا اب بھی انجمن میں ہوتی ہیں میری باتیں

جو تھا وہی ہے اب تک نقشہ مرے وطن کا
بللہ کچھ بتا دے احوال اُس چمن کا

کیا تجھ کو ہم بتائیں صدمے اُٹھائے کیا کیا
چھٹ کر وطن سے ہم نے آنسو بہائے کیا کیا

مدت ہوئی چراغِ اُلفت بُجھا چکے ہیں
اہلِ وطن ہمیں اب شاید بھلا چکے ہیں

نیرِ نثار کچھ تو حالِ وطن بتا دے
خاموش کس لئے ہے اے کم سخن بتا دے

۱۹۴۰ء

برسات کی چاندنی رات

یہ برشگال کی آراستہ سنہری رات
شمیمِ گُل کی یہ پرداختہ سنہری رات
یہ چاندنی، یہ فضائیں، یہ وادیوں کا نکھار
گُماں یہ ہوتا ہے رہ رہ کے پڑ رہی ہے پھوار

یہ زر نگار مناظر، یہ جوشِ نکہت و نُور
زمیں ہے رقص میں، طاری ہے آسماں پہ سُرور
یہ چاندنی ، یہ جھلکتے ہوئے گل و گلزار
ہر ایک شے میں فروزاں ہے زندگی کا شرار
یہ صحنِ باغ میں لہکے ہوئے سُبک غنچے
یہ بوئے عُود سے مہکے ہوئے خنک جھونکے
یہ آسماں، یہ ستاروں کی محفلِ تاباں
یہ گل فروش فضائیں، یہ دل نواز سماں
جبیں، کچھ ایسی ہے روشن عروسِ فطرت کی
بَلائیں لیتی ہیں آکر ہوائیں جنّت کی

یہ جوشِ حُسن و فروغِ بہار کیا کہنا

یہ چاندنی، یہ لبِ جُوئے بار کیا کہنا

بکھر رہا ہے ہر اک نقش زندگانی کا

سرِ حیات پہ ہے تاج شادمانی کا

جو تم نہیں تو یہ جوشِ بہار کچھ بھی نہیں

یہ چاندنی یہ لبِ جُوئے بار کچھ بھی نہیں

مرے لئے

رقصندہ ہے نگارِ گلستاں مرے لئے
گاتے ہیں طائرانِ خوش الحاں مرے لئے
میری ہی آرزو میں غزل خواں ہے بادِ صبح
آتا ہے گھر کے ابرِ بہاراں مرے لئے

روشن ہے میرے واسطے فانوسِ ماہ تاب

تارے ہیں بامِ چرخ پہ رقصاں مرے لئے

کھلتے ہیں میرے واسطے گل ہائے نَو بنَو

شاداب ہے فضائے گلستاں مرے لئے

رخسارِ گُل پہ میرے لئے مضطرب ہے رنگ

رُوئے گہر پہ آب ہے غلطاں مرے لئے

تکتی ہے میری راہ چمن میں کلی کلی

نرگس ہے ایک دیدۂ حیراں مرے لئے

گُل کی قبا بھی چاک ہے میری تلاش میں

سُنبل کی زُلف بھی ہے پریشاں میرے لئے

ہر شاخِ گُل ہے جام بکف میرے واسطے

ہر باغ ہے بہار بداماں مرے لئے

رقصاں ہے موجِ کوثر و زمزم مرے حضور

جُنباں ہے آبِ چشمۂ حیواں مرے لئے

میرے لئے وجود میں آئی ہے کائنات

پیدا مرے لئے ہے تو پنہاں مرے لئے

ملیح آباد ۱۹۳۹ء

ہوائے برشگال

رقص میں ہے روحِ گیتی، وجد میں ہیں نکہتیں
عرش سے گویا اُتر آئیں زمیں پر جنّتیں
یہ شگوفوں کا تبسم، یہ ہواؤں کا سُرور
یہ فضائے ارغوانی، یہ چمن کی نُزہتیں

لائی ہے کیا کیا بہاریں یہ ہوائے برشگال

مست ہے روحِ چمن، گُل ہیں خزاں سے بے خبر

دلکشی چھائی ہوئی ہے گلشنِ شاداب پر

برگِ گُل پر اِس طرح لرزاں ہیں قطرے آب کے

جیسے طائر مائلِ پرواز تولے بال و پَر

لائی ہے کیا کیا بہاریں یہ ہوائے برشگال

راگ میں ڈوبی ہوئی ہے آبشاروں کی صدا

گُنگُناتی یہ ہوائیں، مُسکراتی یہ فضا

یہ طرب افزا مناظر، یہ ترنّم، یہ سُرور

ہر طرف دُھومیں مچاتے یہ طیورِ خوشنوا

لائی ہے کیا کیا بہاریں یہ ہوائے برشگال

آ رہی ہیں بحر و بر کو لے بہ لے انگڑائیاں

دشت سے لے کر چمن تک چھائی ہیں رعنائیاں

غنچے غنچے میں نظر آتا ہے طغیانِ شباب

ڈالی ڈالی سے برستی ہیں نئی برنائیاں

لائی ہے کیا کیا بہاریں یہ ہوائے برشگال

یہ کنارِ آب جو نوخیز پودوں کی قطار

یہ صدائیں کوئلوں کی، یہ پپیہے کی پکار

یہ مہکتے تختۂ گل، لہلہاتے کوہسار

یہ دہکتی آتشِ گل، یہ دمکتے لالہ زار

لائی ہے کیا کیا بہاریں یہ ہوائے برشگال

یہ گُلستاں کا تبسّم، یہ فضاؤں کا نکھار
یہ جمالِ لالہ و گُل، یہ فروغِ سبزہ زار
کوئلوں کی یہ تڑپ، یہ بدلیوں کا انتشار
یہ ہواؤں کا ترنّم، بوندیوں کا یہ سِتار

لائی ہے کیا کیا بہاریں یہ ہوائے برشگال

یہ اُمنڈتی ندّیاں، یہ گھڑ گھڑاتی بدلیاں
یہ لہکتی کھیتیاں، یہ مُسکراتے بوستاں
یہ ترانے، یہ ملاریں، یہ پُھواریں، یہ بہار
یہ چہکتی قُمریاں، اور یہ کھنکتی بوندیاں

لائی ہے کیا کیا بہاریں یہ ہوائے برشگال

لکھنؤ ۱۹۳۹ء

ایک دُکھیا کا پیام

ماگھ بیتا ، گزر گئی گرمی

تجھ کو اب بھی نہ میری سُدھ آئی

دیکھو دیکھو وہ آگئی بَرکھا

ساری دھرتی پہ چھا گئی برکھا

کُوکی کوئل، پپیہا بول اُٹھا
تُجھ کو پھر بھی نہ میرا دھیان آیا

کالی کالی گھٹائیں آتی ہیں
لڑکیاں مل کے گیت گاتی ہیں

ذوقِ عشرت ہے پا بگِل میرا
اُمنڈا آتا ہے آہ دل میرا

سر پہ منڈلا رہے ہیں پھر بادل
بج رہی ہے مَلار پر چھاگل

گا رہی ہیں سہیلیاں ساون
بیلا پھولا ہوا ہے بیچ آنگن

مینھ برستا ہے، بادل آتے ہیں

میرے اوسان کھوئے جاتے ہیں

دھان پھولے کھڑے ہیں باغوں میں

اور جھولے پڑے ہیں باغوں میں

نین دن رین روئے جاتے ہیں

اپنی برکھا میں کھوئے جاتے ہیں

رات کٹتی ہے جاگتے ساری

میں ہوں ماری بِرہ کی دُکھیاری

ایک پَل جی کو سُکھ نہیں آتا

تیرے بِن یہ سماں نہیں بھاتا

نیت نئے گیت گا رہی ہے بہار

بھولے سپنے جگا رہی ہے بہار

دل کو ہے پیاس تیرے درشن کی

آجا ایسے میں رُت ہے ساون کی

مور جنگل میں کر رہے ہیں شور

تجھ کو ڈھونڈوں کہاں کدھر، کس اور

شفق

یہ شفق پگھلے ہوئے سونے کی گویا کان ہے
ہر طرف اُمنڈا ہوا اِک رنگ کا طوفان ہے
عرش سے تا فرش پھیلی ہے گلابی روشنی
ٹوٹ کر برسا ہے دُنیا پر سحابِ زندگی

ہو رہی ہیں صفحۂ عالم پہ کیا گُل کاریاں

یہ ہیں بادل، یا چُنی جاتی ہیں رنگیں چُندریاں

جس طرف دیکھو نیا نقشہ، نیا سامان ہے

یہ زمیں کی آرزُو، یا چرخ کا ارمان ہے

حُسنِ دل افروز ایسا چھا رہا ہے دہر پر

میں ہوں دل سے بےخبر، اور دل ہے مجھ سے بےخبر

یہ سُنہری کون بستی ہے، نہیں چلتا پتا

کیا اُتر آیا زمیں پر کوئی تختہ خُلد کا

پِگھلے سونے کا سمندر موجزن ہے چرخ پر

یا جواہر کا خزانہ ہو گیا پیشِ نظر

یا ارم کی شاہزادی کا ہے یہ رنگیں جلوس

خوش کُن و خوش منظر و خوش رنگ، خوش آئیں جلوس

کاش اِس گلرنگ نظارے میں کھو جائے شمیمؔ

کاش اِن رنگینیوں میں جذب ہو جائے شمیمؔ

۱۹۴۰ء

دیہات کی دُنیا

عجب معصومیت آمیز ہے دیہات کی دنیا

سُرور انگیز و راحت بیز ہے دیہات کی دنیا

سکونِ قلب کی دولت اِسی دنیا میں ملتی ہے

کلی دل کی اِسی گلزار کے دامن میں کھِلتی ہے

لہکتی ہے نوارڑی[1] پھول جب کھلتے ہیں سرسوں کے
مچاتے ہیں اُدھم پیڑوں کے نیچے غول بچوں کے

عجب دیہاتیوں کی زندگی مسرور ہوتی ہے
مسرّت سادگی پر بھی یہاں بھرپور ہوتی ہے

بہت ہی بے سروساماں، یہ سچّی زندگانی ہے
یہاں ہر سانس اک تازہ نویدِ شادمانی ہے

یہاں عشرت کی ملکہ پھول راحت کے لُٹاتی ہے
یہاں افکار و غم کی سانس آکر ٹوٹ جاتی ہے

بھری برکھا میں ہر سُو کھیتیاں جب لہلہاتی ہیں
ندی پر لڑکیاں ساون کے رنگیں گیت گاتی ہیں

ص[1] پھول کی ایک قسم۔

سحر کو جھلملا کر ڈوبنے لگتے ہیں جب تارے
فضا میں کروٹیں لیتے ہیں جس دم نور کے دھارے
دُھنوں پر چکیوں کے چھیڑتی ہیں لڑکیاں نغمے
رسیلے دل کشا نغمے، حسیں نغمے جواں نغمے

یہی دُنیا ہے وہ جو تنگدستی میں بھی شاداں ہے
یہی وہ زندگی ہے شادمانی جس پہ قرباں ہے

ملیح آباد ۱۹۳۹ء

شاعرہ کی موت

زندگی جب موت کی آغوش میں سو جائے گی
جب متاعِ شادمانی یک بیک کھو جائے گی
موت کے ہاتھوں اُجڑ جائیگا جب نخلِ حیات
روح دنیا کے غمِ پیہم سے پائے گی نجات
زندگی کے رُخ پہ جب پڑ جائے گی کالی نقاب
توڑ دے گی جب اجل احساسِ رنگیں کا رباب

سانس کی جب آمد و شد کار کے کا سلسلہ

قطع ہو جائے گا رشتہ جسم کا اور جان کا

بند کر دی جائے گی جس دن غزل خوانی مری

چھین لی جائے گی جب مجھ سے گل افشانی مری

(۲)

انجمن پھولوں کی ہوگی نوحہ خواں میرے بغیر

ہر کلی ہو جائے گی گرمِ فغاں میرے بغیر

پھول کمہلا جائیں گے رنگِ چمن اُڑ جائے گا

گلشنِ عالم بیاباں کا سماں دکھلائے گا

خون برسائے گی یوں پہلی کرن میرے لئے

اشک ٹپکائے گی لیلائے چمن میرے لئے

گنگناتی ندیوں کی راگنی سو جائے گی

ہنسنے والی ہر کلی پژمُردہ سی ہو جائے گی

جب نہ پائے گی مجھے روحِ چمن گھبرائے گی

عارضِ فطرت پہ مایوسی سی اِک چھا جائے گی

اِک اُداسی کا سماں گھر بار پر چھا جائے گا

ایک سنّاٹا در و دیوار پر چھا جائے گا

صبح کو چڑیاں جگانے کو بہت چلّائیں گی

دیکھ کر ساکت مجھے مایوس واپس جائیں گی

سسکیاں لیں گی مری تُربت پہ غمگیں حسرتیں

روئیں گی فُرقت میں میری گلشنوں کی نُزہتیں

مجھ کو ڈھونڈے گی زمانے بھر میں پھولوں کی شمیم

خاک اُڑائے گی مری تربت پہ آ آ کر نسیم

قبر پر دُھومیں مچائیں گے طیورِ خوش نوا

غرقِ غم ہو جائے گی گورِ غریباں کی فضا

پھول فُرقت میں مری ہو جائیں گے خانہ خراب

شبنمِ گُل تکتی رہ جائے گی با چشمِ پُر آب

باؤلی سی میرے غم میں تِتلیاں ہو جائیں گی

جب نہ پائیں گی مجھے، ڈھونڈیں گی اور کھو جائیں گی

جب بھری برسات میں سب مل کے ساون گائیں گی

میری باتیں میری سکھیوں کو بہت یاد آئیں گی

میری بہنوں کی طبیعت میرے بِن گھبرائے گی
میری اماں جان کی راتوں کی نیند اُڑ جائے گی
بھائیوں کے سر پہ سہرا جبکہ باندھا جائے گا
اشک بھر آئیں گے میرا دھیان جب آجائے گا
گھر میں برپا ہوں گی جب شادی کی دُھومیں بے پناہ
یاد میں میری نکل جائے گی سب کے مُنہ سے آہ
باغ سے جب آئے گی غمگیں پپیہے کی پُکار
ہم سنوں کو یاد آئے گی مری بے اختیار
میری الفت خیز باتوں کو بہت ترسیں گے کان
پَر نہ پائے گا کوئی میرا پتا، میرا نشان

پڑھ کے میرے شعرِ تر صبر و سکوں کھوئیں گے سب

دیکھ کر میرے خطوطِ دل نشیں روئیں گے سب

جب کوئی چھیڑے گا قصّہ یا کہانی رات کو

ہم سنیں ترسیں گی کیا کیا میری ایک اِک بات کو

آسماں پر بادلوں کے قافلے جب آئیں گے

میرے نغمے ہم سنوں کو میری یاد آجائیں گے

قدر دانانِ سخن ہو جائیں گے غرقِ محن

سب کہیں گے اُٹھ گئی اِک شاعرہ شیریں سخن

سُن کے اربابِ سخن کو ہو گا اِک صدمہ شدید

ٹوٹ جائے گی مدیرانِ رسائل کی اُمید

پُر اَلم نظمیں لکھی جائیں گی میری موت پر

خواہرانِ نکتہ داں فُرقت میں ہوں گی نوحہ گر

گُلشنِ علم و اَدب پژمردہ سا ہو جائے گا

شاعری کا کچھ دِنوں جیسے مزا کھو جائے گا

پھول تُربت پر مری کوئی چڑھانے آئے گا

کوئی میری موت پر آنسو بہانے آئے گا

جلسہ ہائے تعزیت ہر سمت ہوں گے بار بار

مشرقی بہنیں مری فُرقت میں ہوں گی سوگوار

ذکر میرا جب کبھی بزمِ سخن میں آئے گا

ایک نشتر سا دِلوں میں دفعتہً چُبھ جائے گا

میں وہ غنچہ ہوں مہک اُٹھے جو کمھلانے کے بعد

میری خوشبو دُور تک پھیلے گی مُرجھانے کے بعد

ہو گی فطرت کچھ دنوں تک نوحہ خواں میرے لئے

کچھ دنوں کی جائے گی آہ و فغاں میرے لئے

کچھ دنوں غم میں مرے آنسو بہائے جائیں گے

کچھ دنوں تک میرے افسانے سنائے جائیں گے

ایک دن پھر من چلی دُنیا کو صبر آجائے گا

اور اِس سطح پہ اِک گہرا گہر چھا جائے گا

لکھنؤ ۱۹۳۹ء

رخصت اے ملیح آباد

الوداع اے صبحِ خنداں الوداع

الوداع اے شامِ تاباں الوداع

الوداع اے سرزمینِ رنگ و بُو

اے بہشتِ گل بداماں الوداع

الوداع اے گنگنا تے مرغزار

الوداع ابرِ بہاراں الوداع

الوداع اے نغمہ سنجانِ وطن

الوداع اے باغِ خنداں الوداع

الوداع اے مرکزِ علم و ادب

شاعری کے شکرستاں الوداع

مسکراتی تازہ کلیو السلام

چھوٹتا ہے یہ گلستاں الوداع

یادگارِ احمد و گویا، بشیر

کشورِ صد نکتہ داناں الوداع

الوداع اے رُوحِ پاکانِ وطن

با ہزاراں یاس و حرماں الوداع

اے حریمِ رامش و رنگِ نشاط

اے ندیمِ خوش نوایاں الوداع

تیرا ذرّہ ذرّہ رشکِ آفتاب

الوداع اے ارضِ تاباں الوداع

الوداع اے مسکراتے لالہ زار

اے چھلکتے شبنستان الوداع

کہہ رہی ہے زیرِ لب صبحِ وطن

اے شمیمِ اشک افشاں الوداع

ساون بیتا جائے

کوئل کوکے، بادل برسیں

جیا را ترپے انکھیاں ترسیں

رہ رہ جی گھبرائے

سجنوا ساون بیتا جائے

جھومت جھامت بادر آئے

سکھیوں نے گُن پریت کے گائے

ندیا لہریں کھائے

سجنوا ساون بیتا جائے

کلیاں مہکیں، مُرلی باجی

بیلا پھولا، پُروا سنکی

کارے بادر آئے

سجنوا ساون بیتا جائے

جیون نبّا لے ہچکولے

برہا اگنی مَن میں سُلگے

جان پہ بَن بَن جائے

سجنوا ساوَن بیتا جائے

موہن درشن آ کے دکھاؤ

مُرلی سے پھر جی کو رِجھاؤ

تم بِن کل نا آئے

سجنوا ساوَن بیتا جائے

بچپن

وہ شہریارِ بچپن، وہ تاجدارِ بچپن

وہ گُل فروش بچپن، وہ خوشگوار بچپن

وہ روحِ لالہ و گُل، جانِ بہارِ بچپن

سرشار و مست و خنداں، وہ نغمہ بارِ بچپن

وہ ہائے میرا بچپن، وہ ہائے میرا بچپن

ہر سانس شعر و نغمہ، ہر بات اِک ترنّم

بے وجہ وہ مسرّت، وہ بے سبب تبسّم

گمنام سی اُمنگیں، موہوم سی اُمیدیں

وہ ہر گھڑی شرارت، وہ ہر نفس تلاطم

وہ ہائے میرا بچپن، وہ ہائے میرا بچپن

وہ سر پہ مُسکراتے تاروں کا شامیانہ

گاتی ہوئی فضائیں، ہنستا ہوا زمانہ

نغموں کا وہ تلاطم، وہ کیفِ شاعرانہ

ہر بات اک لطیفہ، رنگین شاطرانہ

وہ ہائے میرا بچپن، وہ ہائے میرا بچپن

شاداب کھیتیوں کے چکر کبھی لگانا

باغوں میں مسکرانا، گلشن میں گنگنانا

پھولوں کو پیار کرنا، کلیوں کے ناز اُٹھانا

پھر خود ہی رُوٹھ جانا اور اُن کو مُنہ چڑھانا

وہ ہائے میرا بچپن، وہ ہائے میرا بچپن

مکر و فریب سے جب خالی تھی یہ خدائی

ہر نقش زندگی تھا اِک نقشِ دلرُبائی

ہر چیز تھی تبسّم کے نُور میں نہائی

جُھک جُھک کے چاند تارے دیتے تھے رُونمائی

وہ ہائے میرا بچپن، وہ ہائے میرا بچپن

وہ دل کشا فضائیں، وہ صبحِ زندگانی

کلیوں کا وہ تبسم، پھولوں کی وہ جوانی

وہ سازِ باد و باراں، وہ کیفِ شادمانی

ہر شام تھی سلونی، ہر صبح ارغوانی

وہ ہائے میرا بچپن، وہ ہائے میرا بچپن

معصومیت کے دن تھے معصومیت کی راتیں

وہ بھولی بھالی کمسن ہم جولیوں کی باتیں

وہ بے خبر زمانہ، وہ دورِ بے نیازی

وہ بے ضرر شرارت، وہ شوخیاں وہ گھاتیں

وہ ہائے میرا بچپن، وہ ہائے میرا بچپن

ساوَن کی اُودی اُودی وہ جھومتی گھٹائیں

وہ وجد میں گلستاں، وہ رقص میں فضائیں

وہ بوئے کمسنی سے مہکی ہوئی ہوائیں

نغموں کا وہ تموّج، بوندوں کی وہ صدائیں

وہ ہائے میرا بچپن، وہ ہائے میرا بچپن

بیلے کی کلی

اے کلی اے کائناتِ رنگ و بُو کی تاجدار
اے عروسِ فصلِ گُل، اے ملکۂ صبحِ بہار
تُو زمیں کا حُسن ہے تو گلستاں کا نُور ہے
تُو بہشتِ رنگ و بُو کی ایک چنچل حُور ہے

وجد میں آتے ہیں تارے تیرا جلوہ دیکھکر
تجھ پہ کرتی ہے نچھاور اوس کے موتی سحر
جوہرِ حسن و لطافت، عصمت و پاکیزگی
پیکرِ ناز و نزاکت، نازشِ دوشیزگی
تیرے کھلنے کا رہا کرتا ہے سب کو انتظار
تیری بُو سے دامنِ بادِ صبا ہے مشک بار
تیرا پیمانہ شرابِ کیف سے لبریز ہے
ہر نفس تیرا گلستاں میں طرب انگیز ہے
اے کہ تو خوابِ چمن کی دلرُبا تعبیر ہے
پیکرِ معصومیت ہے حُسن کی تنویر ہے

اے نویدِ فصلِ گل، اے مژدۂ صبحِ بہار
زینتِ بزمِ چمن، رشکِ بہارِ لالہ زار
تیرے دم سے کائناتِ رنگ و بو معمور ہے
تجھ سے گل مانوس، تجھ سے گلستاں مسرور ہے

لکھنؤ ۱۹۳۸ء

بچپن کی یاد

یاد آتا ہے وہ بچپن کا زمانہ اپنا
دل کو تڑپاتا ہے کیا کیا وہ فسانہ اپنا
ہر صدا لحن تھی، ہر لحن پیام عشرت
بے طلب چرخ دیا کرتا تھا دل کو راحت

رُوح آزاد تھی اُندوہ سے آزاروں سے

دَشت ہی سے تھی نہ وحشت، نہ جلَن خاروں سے

گُلشنِ خُلد کی صحرا سے ہوا آتی تھی

مُجکو آہوں سے بھی نغموں کی صدا آتی تھی

مُنہ مرا بادِ صبا چُوم لیا کرتی تھی

ہر کلی مُجھکو محبّت سے تکا کرتی تھی

جانبِ دَشت میں جس وقت نکل جاتی تھی

صُورتِ دَشت گُلستاں سے بدل جاتی تھی

ہر سحر مجھکو سُناتی تھی خوشی کا پیغام

نہ تو آغاز کا دھڑکا تھا نہ خوفِ انجام

غم کی دیوی مرے نزدیک نہیں آتی تھی

دیکھ لیتی تھی اگر مجھکو تو ٹل جاتی تھی

ہر سحر نغمۂ سرشار نظر آتی تھی

ہر شبِ ماہ گہر بار نظر آتی تھی

دھیان مجھکو کبھی آلام کا آتا ہی نہ تھا

ذکر عشرت کے سوا کچھ مجھے بھاتا ہی نہ تھا

زندگی بے خبرِ ہوش نظر آتی تھی

تیرگی شمع در آغوش نظر آتی تھی

میرے نغمات فضاؤں میں اُڑا کرتے تھے

ماہ و خورشید مرے ساتھ چلا کرتے تھے

ساتھ سامانِ طرب لاتی تھی کیا کیا برسات

جھولتے گاتے گزر جاتے تھے رنگیں لمحات

چند مٹی کے کھلونے تھے پیامِ عشرت

لوریاں دے کے سُلاتی تھی مجھے خود راحت

وہ گھروندے لبِ دریا، وہ کھلونوں کی قطار

وہ چہکتے ہوئے طائر، وہ مہکتے گلزار

کون سا کھیل تھا معصوم جو کھیلا نہ گیا

کون ایسا تھا تماشا کہ جو دیکھا نہ گیا

لڑکیاں ساتھ کی گردن میں وہ ڈالے باہیں

ابھی طفلانہ لڑائی، ابھی باہم چاہیں

باغ کی سیر سے جب لوٹ کے گھر آتے تھے

"ماں" کی آغوش میں کس چین سے سو جاتے تھے

وقت کہتے ہیں جسے عیش کا پیمانہ تھا

دل بلائے غم و اندوہ سے بیگانہ تھا

آہ! اتنے میں زمانے کی ہوائیں بدلیں

آنکھ جھپکی تو وہ موسم وہ فضائیں بدلیں

لکھنؤ ۱۹۳۹ء

آمدِ بہار

صحنِ چمن میں آمدِ فصلِ بہار ہے

بوئے سمن سے موجِ صبا مشکبار ہے

شاخوں سے رنگ رنگ کی پھوٹی ہیں کونپلیں

بے تاب ہو کے کوک اٹھیں مست کوئلیں

ہلکی سی آ رہی ہے صدا آبشار کی
رعنائیاں ہیں دید کے قابل بہار کی
مستانہ وار باغ میں شاخوں کا جھومنا
بھونروں کا بے خودی میں گُلِ تر کو چُومنا
ہلکا سا یہ تبسّمِ رنگیں گُلاب کا
خط جس طرح ہو جام کے لَب پر شراب کا
یہ سُرخ و زرد پھول، یہ شاداب گلستاں
یہ ہر طرف بہار، یہ بادل، یہ بُوندیاں
یہ کیاریاں، یہ پھول، یہ بیلیں، یہ سبزہ زار
صحنِ چمن کی مست ہوا، موسمِ بہار

فرطِ نمو سے رقص میں ہیں نرم ڈالیاں

ہلتی ہیں فرطِ شوق میں کھیتوں کی بالیاں

پھیلی ہوئی ہے بوئے سمن کوہسار میں

دَوڑی ہوئی ہے رُوح نئی سبزہ زار میں

جوشِ بہار باغ میں ہے، مست ہے نسیم

یاد آ رہی ہیں صحبتیں گزری ہوئی شمیم

۱۹۳۷ع

گرمی کی دوپہر

ذرّے دہک رہے ہیں گرمی کی دوپہر ہے

لب تشنہ دشت و در ہیں پژمردہ ہر شجر ہے

ساکت کھڑے ہیں پودے، دم توڑتے ہیں پتّے

شاخوں پہ کوئی دم کے مہماں ہیں زرد غنچے

وحشت برس رہی ہے، پُرہول ہیں بیاباں

چوپائے سر جھکائے جنگل میں ہیں پریشاں

ہر سُو طیورِ گلشن بیگانہ ہوش سے ہیں

افسُردہ گلستاں ہیں، جنگل خموش سے ہیں

کلیوں کے زرد رُخ ہیں لُو کی لپٹ کے مارے

آتش بجاں ہیں دریا، تشنہ دہاں کنارے

شعلے بھڑک رہے ہیں ہر سمت جنگلوں میں

پانی بھرا ہوا ہے یا آگ چھاگلوں میں

فطرت کی نبض گویا ناگاہ تھم گئی ہے

آئینۂ جہاں پر اِک گرد جم گئی ہے

دیوار و دَر سے جیسے آنچیں نکل رہی ہیں

تاریک و تنگ گلیاں شعلے اُگل رہی ہیں

جُھلسا ہوا ہے سبزہ لُو دُھوپ کا ستایا

آغوش میں چمن کی موجِ صبا کا پالا

اِک موت کی اُداسی ہر سمت چھا رہی ہے

تپتی ہَوا سے دوزخ کی آنچ آ رہی ہے

گرمی سے مہ وِشوں کے عارض دہک رہے ہیں

حیواں تڑپ رہے ہیں، انساں سِسک رہے ہیں

مُضطر ہے رُوحِ گُلشن جو ہے سو ہے پریشاں

سُنسان ہیں گلستاں، جنگل پڑے ہیں ویراں

گرمی سے حُسنِ عالم گویا پگھل رہا ہے
یُوں آج ذرّہ ذرّہ شعلے اُگل رہا ہے
پھُولوں کی پتّی پتّی گرمی سے جَل گئی ہے
جَورِ خزاں سے ساری دُنیا بَدل گئی ہے

ملیح آباد ۱۹۴۱ء

چاندنی رات

کس قدر دلربا ہے جون کی رات
آرہی ہے صدائے سازِ حیات
یہ شگوفے، یہ بوستاں، دریا
واہ کیا رات ہے نشاط افزا

ہے فضاؤں پہ اِک عجیب سکون
بج رہا ہے کہیں گراموفون
چاندنی کی ہیں ضو فشاں لہریں
گیت کی بہہ رہی ہیں یا نہریں
سبزہ زاروں پہ ہے عجیب بہار
دشت و صحرا پہ ہے غضب کا نکھار
مُسکراتے مناظرِ قُدرت
نَم فضائیں، ہواؤں میں فرحت
صحنِ گلشن میں بھیگی بھیگی گھاس
لیتی ہے کیسی ہلکی ہلکی سانس

سارے عالم پہ کیف طاری ہے

چاند کا فیضِ عام جاری ہے

چاندنی میں یہ نہر پانی کی

سیلِ پگھلی ہو جیسے چاندی کی

موجِ دریا میں عکس تاروں کا

بحرِ سیمیں کا جیسے ہو دھارا

بانکپن، حُسن و رنگ، شادابی

نئے جلوے، نئی جہاں تابی

رُوحِ کونین غرقِ عشرت ہے

دل مرا پھر بھی وقفِ حسرت ہے

مالن سے

اے چمن کی شاہزادی، جنگلوں کی تاجدار

آرزوئے سبزہ زار و نغمۂ صبحِ بہار

تیری چشمِ مست کا ہر ایک گُل بیمار ہے

حُسن تیرا دیکھ کر رُوحِ چمن سرشار ہے

جلوہ افگن کامیابی کا ترے سر پر ہے تاج

تیرے دَم سے باغ و راغ و دشت ہیں گلزار آج

جان دیتے ہیں گُلِ تر تیری ایک اِک آن پر

بے نیازِ ناز و نخوت، بھولی بھالی بے خبر

خوش خرامی کا تری رفتار دیتی ہے سبق

اُڑنے لگتا ہے تجھی کو دیکھ کر رنگِ شفق

تیرے دامن کی ہوا سے جاگ اُٹھتے ہیں چمن

شاد ہو جاتے ہیں تجھ کو دیکھ کر گُل پیرہن

ان سنے گیتوں کا جادو ہے تری آواز میں

رُوح پھولوں کی بسی ہے تیری چشمِ ناز میں

بجلیوں کا رقص اِک ہلکے تبسّم میں لئے

جا رہی ہے کس طرف دامن کو پھولوں سے بھرے

تجھ کو پھولوں کی قسم، صبحِ بہاراں کی قسم

لالہ زاروں کی قسم، رنگِ گلستاں کی قسم

خوش اَدا مالن کہاں سے یہ بتا آتی ہے تُو

پھول یہ کس کے لئے ہر روز لے جاتی ہے تُو

ملیح آباد ۱۹۳۸ء

سعیدہ

اے سعیدہؔ شمیم کی ہمراز

اے وفاکیش و ہمدم و دمساز

تیری ہر سانس دلنواز نسیم

تیری ہر بات کوثر و تسنیم

یاد ماضی کی ہیں ملاقاتیں

قہقہے، چاہ، پیار کی باتیں

(۱) سعیدہ خاتون میری نہایت عزیز دوست اور ماموں زاد بہن۔ شمیم

شادمانی کے وہ درخشاں دن

وہ بہاریں، وہ خوش ادا ہم سن

ہائے "قصرِ سحر"[۱] میں وہ جلسے

وہ لطیفے، وہ چہچہے، نغمے

اب وہ راتیں رہیں نہ وہ باتیں

بیت جاتی تھیں باتوں میں راتیں

یاد ہیں وہ فضائیں گلشن کی

چاندنی اور وہ بھی بچپن کی

یاد ہے خوشگوار وہ موسم

کھیلتے تھے چھلی چھلیا ہم

(۱) "قصرِ سحر" میرے ماموں صاحب قبلہ حضرت جوش ملیح آبادی کی کوٹھی جو ملیح آباد میں واقع ہے۔ شمیم

میل ابھی تھا، ابھی لڑائی تھی
یوں بھی اور وُوں بھی دلرُبائی تھی
وہ جمیلہؔ کی شوخیاں ہردم
قدسیہؔ کے وہ قہقہے پیہم
وہ قریشہؔ کا رنگِ کم سخنی
فاطمہؔ کہتی تھی یہ ہے گھُنی
ہائے انورؔ کا رُوئے مہتابی
وہ جمیلہؔ کے رُخ کی شادابی
وہ شرفتؔ کی دلنواز ہنسی
نہ تھی جس میں جھلک بناوٹ کی

سب کامل کر وہ باغ میں جانا

ہر رَوِش پر وہ پھول برساتا

گُنگُناتے تھے، گیت گاتے تھے

مُنہ چڑھاتے تھے، مُسکراتے تھے

گاتے گاتے جب اُوبھ جاتے تھے

باغ بھر میں اُدھم مچاتے تھے

مسکراتی تھی جب شبِ ضَو پاش

بیٹھ کر کھیلتے وہیں سب تاش

جوشؔ کے شعرِ تَر کبھی پڑھنا

جھوٹے قصّے نئے نئے گڑھنا

رات بھیگی ہوئی بھری برسات

مُسکراتی ہوئی وہ صبحِ حیات

اونگھتے پیڑ، جھومتے بادل

دھیمی دھیمی ہوا، گھنے جنگل

ریل کا یک بیک گزر جانا

کھیتوں پر دھوئیں کا منڈلانا

ہائے پیتاؔ[1] کا رقصِ بے پروا

کانپنا عکس چاند تاروں کا

وہ طلوعِ سحر کے نظارے

وہ فضاؤں میں نور کے دھارے

[1] پیتاؔ تالاب کا نام جو قصرِ سحر کے سامنے ہے۔

کیف برساتی روحِ کون ومکاں

صبحِ فردوس باغ میں خنداں

۲

زندگی کا بدل گیا وہ دَور

اَور ہے دَور اور اس کا طَور

ہائے جب سے گئی ہو تم دلّی

جیسے مُرجھا گئی ہے دل کی کلی

اب نہ وہ دن رہے نہ وہ راتیں

ہم سِنوں سے نہ وہ ملاقاتیں

زندگی کے بدل گئے وہ دن
کیسے کیسے بچھڑ گئے ہم سِن

ہر طرف ظُلمتیں ہیں فُرقت کی
اِک کرن بھی نہیں مسرّت کی

بزمِ اُمّید ہو گئی برباد
سُونا سُونا سا ہے ملیح آباد

ہوگیا گُم جمالِ لیل و نہار
گلشنِ دل سے جا چکی ہے بہار

اے سعیدہ رہو ہمیشہ شاد
دل کو تڑپاتی ہے تمہاری یاد

ملیح آباد ۱۹۳۷ء

مایوس شام

کل دریچہ کھول کر میں نے جو ڈالی اِک نظر
شام کی آغوش میں گُل سو رہے تھے بے خبر
تھم چکی تھی موجِ دریا، سُست تھی نبضِ جہاں
جا چکا تھا سُوئے مغرب آفتابِ ضَوفشاں

ماند تھا حُسنِ گلستاں، جا چکی تھیں تتلیاں

ہو رہا تھا سارا عالم مائلِ خوابِ گراں

ہر طرف چھائی ہوئی تھیں شام کی تاریکیاں

جس طرف دیکھو نظر آتا تھا اِک ہُو کا سماں

سُونے سُونے تھے شبستاں، بند تھا شورِ حیات

جا رہی تھی نیند کی آغوش میں کُل کائنات

اونگھتے غنچے، ہوائیں سُست، ساکت وادیاں

کھوئی کھوئی سی فضائیں، سوتے سوتے بوستاں

آشیانوں میں پرندے ہو چکے تھے محوِ خواب

ڈھل چکا تھا شاہدانِ باغِ عالم کا شباب

چھین لی تھیں شب نے آ کر زمزمہ آرائیاں

لے رہا تھا دہر سونے کے لئے انگڑائیاں

چاند بھی نکلا تو نکلا اشک ٹپکاتا ہوا

اپنی محروم طرب کرنوں سے شرماتا ہوا

۱۹۳۹ء

برسات کی گھٹائیں

بادل برس برس کر طوفاں اُٹھا رہے ہیں

گلزار دھل رہے ہیں، غنچے نہا رہے ہیں

دریا مچل مچل کر نغمے سُنا رہے ہیں

طائر چہک چہک کر دھومیں مچا رہے ہیں

رنگین ہیں فضائیں پُر کیف ہیں ہوائیں

دھومیں مچا رہی ہیں برسات کی گھٹائیں

بُوندوں کے موتیوں سے صحرا دمک رہے ہیں
سبزہ لہک رہا ہے، پودے لچک رہے ہیں

مدہوش ہیں ہوائیں، گلشن مہک رہے ہیں
چشمے اُبل رہے ہیں، غنچے چٹک رہے ہیں

رنگین ہیں فضائیں پُر کیف ہیں ہوائیں
دُھومیں مچا رہی ہیں برسات کی گھٹائیں

طاؤس کی صدائیں رہ رہ کے آ رہی ہیں
کوئل بھی نغمہ زن ہے چڑیاں بھی گا رہی ہیں

رعنائیاں چمن کی دل کو لُبھا رہی ہیں
سینوں میں ایک طُوفان پیہم اُٹھا رہی ہیں

رنگین ہیں فضائیں، پُر کیف ہیں ہوائیں
دُھومیں مچا رہی ہیں برسات کی گھٹائیں

گلزار و دشت و گلشن سرشار ہو رہے ہیں

میدان و کوہ و صحرا گلزار ہو رہے ہیں

گل مسکرا رہے ہیں سرشار ہو رہے ہیں

پہلو بدل کے دریا بیدار ہو رہے ہیں

رنگین ہیں فضائیں، پُرکیف ہیں ہوائیں

دھومیں مچا رہی ہیں برسات کی گھٹائیں

ملیح آباد ۱۹۳۶ء

اُداس شام

آ رہی ہے شام کالی زُلف بکھراتی ہوئی

تیرگی ہی تیرگی ہر سمت پھیلاتی ہوئی

تھم گئے دریا کے نغمے، ہو گئی غمگیں فضا

جُھٹ پُٹے میں دُور سے کا فر پپیہا بول اُٹھا

صبح کی رعنائیاں تاریکیوں میں کھو گئیں

دہر کی رنگینیاں اوجھل نظر سے ہو گئیں

ہر کلی ساکت ہوئی، ہر شاخ تھرّانے لگی

دم شگوفوں کا رُکا، اِک یاس سی چھانے لگی

غرق بحرِ تیرگی میں ہو گیا رنگِ بہار

بوندیوں کا گلستاں میں تھم گیا دلکش ستار

اُڑ گیا ہر غنچۂ شاداب کے عارض کا نُور

رونقیں رخصت ہوئیں، برہم ہوئی بزمِ طیُور

چھا گئے گردوں پہ وحشت ناک متوالے سحاب

تیرگی نے ڈال دی رنگیں فضاؤں پر نقاب

اُڑ گئے طائر، فضائیں سسکیاں لینے لگیں
درسِ عبرت زندگی کو ظُلمتیں دینے لگیں

ہو گئے خاموش صحرا میں طیورِ خوش نوا
چھا گئی ظلمت فضا پر، آ گئی شامِ بلا

ملیح آباد ۱۹۳۸ء

گمشدگی

کیا ہوئی فطرت کی وہ گوہر فشانی کیا ہوئی
موسمِ باراں کی وہ اُٹھتی جوانی کیا ہوئی
دھوم باغوں میں نہ وہ رونق بیابانوں میں ہے
کیا ہوئی وہ مطربوں کی خوش بیانی کیا ہوئی

وہ چٹکتی نرم کلیوں کا تبسّم کیا ہوا

وہ مہکتے بوستانوں کی جوانی کیا ہوئی

کس طرف گُم ہو گیا وہ بادو باراں کا خروش

ساحلوں کا شور، دریا کی روانی کیا ہوئی

بزمِ گُل بے رنگ ہے، بے نُور فانُوسِ اُفق

رُوئے گردُوں پر شفق کی ضو فشانی کیا ہوئی

وہ مہکتی سرد راتوں کا ترنّم کیا ہوا

وہ ترانے، وہ امنگیں، وہ جوانی کیا ہوئی

زرد ہے رُوئے چمن، بے نُور ہے بزمِ جمال

نازکلیوں کا، گُلوں کی دِلستانی کیا ہوئی

کس طرف گُم ہو گئی رعنائیِ لیل و نہار

صبحِ رنگیں اور شامِ ارغوانی کیا ہوئی

بُجھ گئی شمعِ سخن، بے نُور بزمِ فکر ہے

وہ شمیمِ نکتہ داں کی خوش بیانی کیا ہوئی

شملہ ۱۹۴۴ء

دعوتِ نغمہ

ہاں ساز اُٹھا سازِ خوش آواز مغنّی

برسات کی بھیگی ہوئی یہ رات سحابی
آفاق طربناک فضائیں ہیں شبابی

مانا کہ پسِ پردہ بھڑکتے ہیں شرارے
گل پھر بھی ہیں بدمست، ہوائیں ہیں شرابی

ہنستے ہوئے پھولوں پہ چھلکتی ہوئی شبنم
کلیوں کو ستاروں نے بنایا ہے شہابی

اِس منظرِ پُرکیف کا ہو لُطف دوبالا
بس دیر نہ کر تو بھی نوازن ہو شتابی

ہاں ساز اُٹھا سازِ خوش آواز مغنّی

ساحل پہ پپیہے کی صدا جھوم رہی ہے
کونین ہے سرشار، فضا جھوم رہی ہے

گلزار میں پھولوں نے نیا رنگ جمایا
اشجار کے سائے میں ہوا جھوم رہی ہے

یہ موجِ ترنّم، یہ ترانے، یہ مَلاریں
ہر چیز بصد عشوہ و ادا جھوم رہی ہے

چھیڑے ہیں حسیں رات نے کچھ ایسے ترانے
ہر تان پہ بلبلِ بقا جھوم رہی ہے

ہاں ساز اٹھا ساز، خوش آواز مغنّی

ہر گام پہ مُڑتا ہوا گاتا ہوا پانی
موجوں کا تلاطُم، یہ ترنّم، یہ روانی

گُلشن پہ ہیں چھائی ہوئی گھنگور گھٹائیں
ہر پھول فسانہ ہے تو ہر غنچہ کہانی

بے تاب ہیں قلب خس و خاشاک میں ارماں
پیغام چلے آتے ہیں کانٹوں کی زبانی

یہ محفلِ احباب، یہ گُلرنگ فضائیں
آئے گی نہ پھر ایسی کوئی رات سُہانی

ہاں ساز اُٹھا ساز خوش آواز مغنّی

یوں نغمہ سرا ہو کہ یہ عالم ہی بدل جائے

افسوں تراب درد حوادث پہ بھی چل جائے

باقی نہ رہے جادۂ ہستی میں اندھیرا

گم نا ہوا انسان پھر اک بار سنبھل جائے

پیشانیٔ حسرت پہ بشاشت دمک اُٹھے

کانٹا سا تپاں قلب کی ہر رگ سے نکل جائے

مہتاب مسرت ہو نمایاں شب غم سے

ہر ایک فغاں قالب نغمات میں ڈھل جائے

ہاں ساز اُٹھا ساز خوش آواز مغنی

اے مطربِ گل بار، فضاؤں کو ہنسا دے

نغموں سے بیاباں کی خموشی کو جگا دے

مُنہ دیکھ کے رہ جائے یہ بے مہریٔ دوراں

اے روحِ طرب رنگ حوادث کا اُڑا دے

ہر تان پہ لا راہ پہ بھٹکے ہوئے دل کو

وہ گیت سُنا عظمتِ ہستی جو بڑھا دے

کونین کی افسردہ تمنّائیں تڑپ جائیں

طوفانِ ترنّم میں زمانے کو بہا دے

ہاں ساز اُٹھا ساز خوش آوازہ مغنّی

ریل سے

صبا کی طرح گن گناتی چلی جا

مجھے بستیوں سے چھڑاتی چلی جا

کسی کو کسی سے ملاتی چلی جا

کسی کو ہنساتی، رُلاتی چلی جا

کسی کی اُمیدیں جگاتی ہوئی چل

کسی کا مقدر سُلاتی چلی جا

وطن کی کہانی سُناتی ہوئی چل

مرے آنسوؤں کو سُکھاتی چلی جا

ہنسا کر، رُلا کر، رُلا کر، ہنسا کر

محبت کی جنت بساتی چلی جا

حسیں جنکشنوں پر ٹھہرتی ہوئی بڑھ

نیا ایک عالم دکھاتی چلی جا

فضا میں ترنم کے طوفاں اُٹھا کر

پہاڑوں پہ دھومیں مچاتی چلی جا

ہوا میں دل آویز نغمے بہا کر

لگاتار گاتی بجاتی چلی جا

دلِ مُردہ کو شاد کرتی ہوئی بڑھ

خوشی کے ترانے اُڑاتی چلی جا

بدلتے ہیں کس طرح نقشے دلوں کے

ہر اِک گام پر یہ جتاتی چلی جا

مرے دل میں اب تاب باقی نہیں ہے

خوشی کے زمانے بھلاتی چلی جا

فریبِ تمنّا بہت دے چکا دل

شکنجے سے غم کے چھُڑاتی چلی جا

(۲)

مجھے فکرِ دُنیا سے آزاد کر دے

تخیّل کی بستی کو آباد کر دے

مناظرِ ظاہر کا دیوانہ کر دے

مجھے شمعِ فطرت کا پروانہ کر دے

مجھے چھوڑ دے بَن کی ویرانیوں میں

گزاری بہت عیش سامانیوں میں

مَیں جنگل کی خاموشیوں میں رہوں گی

کسی سے نہ اپنا غمِ دل کہوں گی

اِسی عالمِ رنگ و بُو میں رہوں گی

جو سہنا ہے دُکھ درد تنہا سہوں گی

غریبوں کی دُنیا

نہ پوچھو بلاکش غریبوں کی حالت
حقیقت ہے یہ کچھ کہانی نہیں ہے
تبسم کی قلت تو ہے اِس گھر میں
مگر آنسوؤں کی گرانی نہیں ہے
غریبوں کی بستی میں اِک دن سُنو تو
کوئی نَے بجز نوحہ خوانی نہیں ہے

نہ آہوں میں ڈھونڈو مسرت کی تانیں
یہاں سوز ہے شادمانی نہیں ہے
تمناؤں کا ہے سسکتا جنازہ
غریبوں کی یہ نوجوانی نہیں ہے
نہ پوچھو ستم دیدہ ہیں زندہ کیوں کر
یہ سکرات ہے زندگانی نہیں ہے

۱۹۳۹ء

تجدیدِ بہار

لو نسیم سحر گُن گُناتی چلی
ہر روش پر شگوفے کھِلاتی چلی
تازگی کے خزانے لُٹاتی چلی
نکہتوں کو ہوا میں اُڑاتی چلی
آگئی پھر چمن میں بہار آگئی

آسماں سُرمئی، ارغوانی زمیں
ہے کہیں سرو و سنبل، کہیں یاسمیں
غُنچہ غُنچہ چمن میں سُخن آفریں
زندگانی ہے اِک نغمۂ دِل نشیں
آگئی پھر چمن میں بہار آگئی

لیتی انگڑائیاں جاگ اُٹھی زندگی

تازہ سے مُسکرانے لگی ہر کلی

غُنچے غُنچے میں خنداں ہوئی تازگی

ذرّے ذرّے پہ چھانے لگی بیخودی

آگئی پھر چمن میں بہار آگئی

پھر عروسِ بہارِ چمن جاگ اُٹھی

گُل ہنسے اِس طرح، انجمن جاگ اُٹھی

پھر تمنّائے کوہ و دمن جاگ اُٹھی

جاگ اُٹھی روحِ سرو وسمن جاگ اُٹھی

آگئی پھر چمن میں بہار آگئی

پھر ہوائیں گلستاں کو لہکا گئیں

کیا یہ سُن گُن بہار آنے کی پاگئیں

رقص کرتی ہوئی تتلیاں آگئیں

غنچے غنچے پہ رعنائیاں چھا گئیں

آگئی پھر چمن میں بہار آگئی

پھر ہے لبریزِ نغمہ فضائے چمن

دیدنی ہے گُل و نسترن کی پھبن

پھول رقصاں ہیں، کھِلتی کلی خندہ زن

سادگی ہے کہیں تو کہیں بانکپن

آگئی پھر چمن میں بہار آگئی

پھر ہے ڈوبا ہوا عطر میں گلستاں
پھر ہیں معمورِ عشرت زمان و مکاں
پھر رواں ہو گئے حسن کے کارواں
عالمِ رنگ و بو ہو گیا پھر جواں
آ گئی پھر چمن میں بہار آ گئی

پھر شفق سے فضائیں ہوئیں لالہ گوں
چھا گیا سبزہ زاروں پہ رنگِ فسوں
آبشاروں کے بجنے لگے ارغنوں
ہو گئی تازہ دیرینہ رسمِ جنوں
آ گئی پھر چمن میں بہار آ گئی

پھر ترانے چھیڑے مرحبا! مرحبا!

زیرِ لب گنگنانے لگی پھر صبا

چھا گئی جھوم کر گلستاں پر گھٹا

کیف ہر سُو چمن میں برسنے لگا

آ گئی پھر چمن میں بہار آ گئی

ابر اُٹھ اُٹھ کے موتی لُٹانے لگے

آبِ کوثر سے غُنچے نہانے لگے

دشت جاگے، چمن مسکرانے لگے

خواب ماضی کے پھر یاد آنے لگے

آ گئی پھر چمن میں بہار آ گئی

راولپنڈی ۱۹۵۷ء

مَیں اور تُو

یاس کا دُھندلا سا اِک نقشا ہوں مَیں
جِھلملاتا شام کا تارا ہوں مَیں
صورتِ مہتاب تُو گرمِ خرام
ریگ میں کھویا ہوا دریا ہوں مَیں

تُو سراپا کیف و روحِ نغمگی
ہجر کا اندوہ گیں نوحہ ہوں مَیں
تیرا نظارہ بہارِ رنگ و بُو
وادیٔ غربت کا اِک کانٹا ہوں مَیں
تیری ہستی رونقِ بزمِ جمال
یاس کا مِٹتا سا نقشِ پا ہوں مَیں
ضَو فشاں ہے تیرا فانوسِ حیات
شوق کا بجھتا ہوا شعلہ ہوں مَیں
صبحِ رنگیں پَرتَوِ عارض ترا
شام کا اُترا ہوا چہرا ہوں مَیں

کچھ تجھے بھی ہے خبر اے بے خبر

زندگی کیا تھی مری اور کیا ہوں مَیں

اس کے آگے کیا کہوں کیوں کر کہوں

تُو ہے بے پروا کہ بے پروا ہُوں مَیں

دوستِ گلعذار

(نذرِ سعیدہ)

اب بھی فضا ہے خوشگوار

اب بھی بسے ہیں کوہسار

اب بھی ہوا ہے مشکبار

اب بھی چمن ہے پُربہار

آ کہ بہت ہوں بے قرار

اے مری دوستِ گلعذار

آتی ہیں اب بھی بدلیاں
اُڑتی ہیں شوخ تتلیاں
ہنستے ہیں دشت و گلستاں
پڑتی ہیں نرم بُوندیاں
پھولوں پہ ہے وہی نکھار
اے مری دوستِ گلعذار

گاتی ہیں اب بھی لڑکیاں
جھولوں پہ باغ میں یہاں
اب بھی ہے دیدنی سماں
اب بھی وہی ہیں شوخیاں
اب بھی خلوص ہے شعار
اے مری دوستِ گلعذار

تاروں کی اب بھی چھاؤں میں
چھا گلیں پہنے پاؤں میں
ڈوبی ہوئی اداؤں میں
آتی ہے ریل گاؤں میں
چھیڑتی باغ میں ستار
اے مری دوستِ گلعذار

آتی ہے اب بھی بار بار
بَن سے صدائے آبشار
گاتی ہے بلبلِ بہار
چھیڑتے ہیں قدرتی ستار
روحِ چمن ہے نغمہ بار
اے مری دوستِ گلعذار

اب بھی فضا پہ ہے شباب
چھیڑتے ہیں ہر طرف رباب
اب بھی وہی ہے آب و تاب
حُسنِ چمن ہے بے نقاب
اب بھی کھِلے ہیں لالہ زار
اے مری دوستِ گلعذار

اب بھی نسیمِ دلستاں
ہوتی ہے ہر طرف رَواں
اب بھی حسیں ہیں بوستاں
اب بھی فضا ہے زَر فشاں
آجا، ہے جوش پر بہار
اے مری دوستِ گلعذار

آرزوئیں ہیں اشکبار

شام و سحر ہوں بے قرار

ہجر میں دِل ہے سوگوار

آنکھیں ہیں محوِ انتظار

شکل دکھا پھر ایک بار

اے مری دوست گلعذار

۱۹۳۸ء
ملیح آباد

مہتاب کی شعاعیں

مہتاب کی جاں بخش جب آتی ہیں شعاعیں
گلشن میں عجب رنگ جماتی ہیں شعاعیں

مُنھ غنچۂ نو خیز کا شبنم سے دُھلا کر
خوشبو سے بسی شب میں سُلاتی ہیں شعاعیں

گہ ناز سے ہنستے ہوئے سبزے پہ مچل کر
ہر سمت نئے پھول کھلاتی ہیں شعاعیں

دل گلشنِ افسردہ کا کِھل جاتا ہے جیسے

گردُوں کے دریچوں سے جب آتی ہیں شعاعیں

تاروں کی خنک چھاؤں میں ہر شب کو زمیں پر

اِک مسندِ زرتار بچھاتی ہیں شعاعیں

ہر برگ پہ شبنم کی چھڑک دیتی ہیں افشاں

کلیوں کو دلہن روز بناتی ہیں شعاعیں

پھولوں سے لپٹ کر، کبھی کانٹوں سے اُلجھ کر

تالاب کی موجوں میں نہاتی ہیں شعاعیں

ظلمت سے لرزتی ہوئی خاموش فضا میں

گنجینۂ انوار لُٹاتی ہیں شعاعیں

گلشن کی مہکتی ہوئی سرشار فضا میں

اِک عالمِ فردوس بساتی ہیں شعاعیں

جب پچھلے پہر ڈوبنے لگتے ہیں ستارے

اِک نغمۂ خاموش سناتی ہیں شعاعیں

خاموش محبت کے ترانے کبھی گا کر

سینے میں عجب حشر اُٹھاتی ہیں شعاعیں

مغموم ہے کیوں اے دلِ افسردہ کہ اب تک

پیغام مسرت کا سُناتی ہیں شعاعیں

ملیح آباد ۱۹۴۲ء

نور پاش رات

بام و در پر دیر سے ہے چاندنی پھیلی ہوئی
کیفِ موسیقی میں ہے ٹھنڈی ہوا ڈوبی ہوئی
یہ گماں ہوتا ہے بھر کر نور سے اپنے طبق
آسماں نے حل کئے ہیں سونے چاندی کے ورق
خواب کا عالم ہے سنّاٹا سُرور آمیز ہے
تو عروسِ شب کا نظّارہ نشاط انگیز ہے

ہر گُلِ نَوخیز گویا اک چھلکتا جام ہے
جو صبا کی موج ہے تسکین کا پیغام ہے

ہر طرف ہے ایک کیفِ بیخودی چھایا ہوا
رُوئے گیتی پہ ہے رنگِ دلبری چھایا ہوا

ہو گیا تبدیل خاموشی میں عالم کا خروش
سو رہے ہیں نیند کی آغوش میں احساس و ہوش

غنچے غنچے سے نمایاں جلوۂ معبود ہے
ذرّے ذرّے کی زباں پر نغمۂ داؤد ہے

ملیح آباد ۱۹۳۷ء

پیامِ حسرت

ہیں بہاریں ختم، تم اب بھی نہیں آؤ گے کیا؟

آنہ جاؤ کیف زا اُودی گھٹاؤں کی طرح

آنہ جاؤ دلکشا رنگیں صداؤں کی طرح

آنہ جاؤ نکہتِ فصلِ بہاری کی مثال

آنہ جاؤ عطر میں ڈوبی ہواؤں کی طرح

ہیں بہاریں ختم، تم اب بھی نہیں آؤ گے کیا؟

زندگی افسانۂ غم ہے تمہارے ہجر میں
محفلِ اُمّید برہم ہے تمہارے ہجر میں
دل کسی رنگیں مناظر سے بہلتا ہی نہیں
سُونا سُونا سارا عالم ہے تمہارے ہجر میں
ہیں بہاریں ختم، تم اب بھی نہیں آؤ گے کیا؟

پڑ رہی ہے دھیمی دھیمی گلستانوں میں پھُوار
بھیگی بھیگی سی فضا ہے، نکھری نکھری سی بہار
جنگلوں کے سناٹے میں ہوتی ہے وحشت بار بار
ہُوک سی دل میں اُٹھاتی ہے پپیہے کی پُکار
ہیں بہاریں ختم، تم اب بھی نہیں آؤ گے کیا؟

زندگانی کے اُفق پر نُور برساؤ گے کب

گُلشنِ اُمید کے غنچوں کو مہکاؤ گے کب

منتظر آنکھیں ہیں اب دیدار دکھلاؤ گے کب

اب نہ آؤ گے تو پھر کیا جانے تم آؤ گے کب

ہیں بہاریں ختم، تم اب بھی نہیں آؤ گے کیا؟

اِن گھٹاؤں کی قسم، اِن کوہساروں کی قسم

اِن فضاؤں کی قسم، اِن لالہ زاروں کی قسم

اِن پھواروں کی قسم، اِن آبشاروں کی قسم

بے مزہ ہے زندگی رنگیں بہاروں کی قسم

ہیں بہاریں ختم، تم اب بھی نہیں آؤ گے کیا؟

آ نہ جاؤ کیف برساتے بہاروں کی طرح

آ نہ جاؤ گنگناتے آبشاروں کی طرح

آ نہ جاؤ گلستاں میں نور برساتے ہوئے

آ نہ جاؤ مسکراتے چاند تاروں کی طرح

ہیں بہاریں ختم، تم اب بھی نہیں آؤ گے کیا؟

ایک حسرت آلود شام

لے رہی تھی اُکھڑی اُکھڑی سانس جنگل کی ہوا
دم بخود بیٹھے تھے شاخوں پر طیورِ خوش نوا
تیرگی چھائی ہوئی تھی گلشنِ شاداب پر
غنچہ غنچہ غمزدہ تھا، پتہ پتہ نوحہ گر
حسرتیں چھائی ہوئی تھیں، پڑ رہی تھی کچھ پھوار
مقبرے سے بول اُٹھتا تھا پپیہا بار بار

آسماں پر ایک سنّاٹا سا تھا چھایا ہوا
نوَعروسِ شام کا چہرہ تھا کمُھلایا ہوا
ڈھل چکا تھا سوئے مغرب آفتابِ ضَوفشاں
ریل کا منڈُلا رہا تھا کوہساروں پر دھُواں
ذرّے ذرّے کا نظر آتا تھا دل کھویا ہوا
دھُندلی دھُندلی تھی فضا تالاب تھا سویا ہوا
دفعتہً آئی صدا ایسی کہ دَم گھُٹنے لگا
ہاتھ سے دامن قرار و صبر کا چھُٹنے لگا
قبر پر بیٹے کی بیٹھی اِک ضعیفہ دل فگار
رو رہی تھی سِسکیاں بھرتی ہوئی زار و قطار

آرزوؤں پر تھی حسرت کی گھٹا چھائی ہوئی

جان ہونٹوں پر تمناؤں کی تھی آئی ہوئی

سُرخ آنکھیں، زرد چہرہ، خستگی لہجے میں تھی

یاس کی ماری ہوئی، کُچلی ہوئی آلام کی

کر رہی تھی تربتِ لختِ جگر سے یُوں کلام

لوٹ آ آنکھوں کی ٹھنڈک، اے مرے ماہِ تمام

ہو گئی دشوار مجھکو زندگی تیرے بغیر

چھا گئی ہر سمت غم کی تیرگی تیرے بغیر

گھر کا گھر ہے، ہے، ترے مرتے ہی سُونا ہو گیا

غم کی قسمت جاگ اُٹھی، میرا مقدر سو گیا

لُٹ گیا تیری دُلہن کا ناز پروردہ سُہاگ
جاگتے ہی سو گئے بدبخت دُکھیاری کے بھاگ

بادلوں میں چھُپ گیا میری سحر کا آفتاب
آہ یہ اَندھیر، ایسا رُوح فرسا انقلاب

پڑ گئی کیسی یہ بپتا، اے مرے پروردگار
لُوٹ لی ظالم اَجل نے زندگانی کی بہار

موت بس جلد آ کہ تسکیں پائے دل کا اضطراب
خاک ایسی زندگی پر جس میں ہو مٹّی خراب

کہہ کے یہ محزوں ضعیفہ ہو گئی خاموش سی
اک اَلم انگیز مایوسی فضا پر چھا گئی

ظُلمتوں نے ڈال دی سُنسان جنگل پر نقاب

بڑھ گیا اِس تیرگی میں اور دل کا اضطراب

گرتی پڑتی وہ ضعیفہ ہو گئی گھر کو رواں

اور اِدھر ہر چار جانب چھا گیا ہُو کا سماں

شب کے سنّاٹے میں آتی عبرت آگیں یہ صدا

دیکھ چشمِ غور سے نقشہ طلسمِ دہر کا

زندگی انساں کی کیا، اِک بُلبُلا ہے آب کا

یا فقط وہم و گُماں ہے، یا سماں ہے خواب کا

ملیح آباد ۱۹۳۷ع

وادیِ مرگ

نکلتی ہیں شبِ غم کی جہاں سے سیکڑوں راہیں
مچلتی ہیں جہاں نغموں کے بدلے خوں چکاں آہیں
جہاں بیداد کے برباد کُن بادل برستے ہیں
جہاں ظالم اجل کے سانپ انسانوں کو ڈستے ہیں
جہاں جلتے جہنم میں مقدر جھونک دیتا ہے
جہاں دیوِ ستم رُوحِ لطافت کھینچ لیتا ہے

جہاں بل کھا رہے ہیں اشکِ حسرت آبشاروں میں

جہاں شعلے بھڑکتے ہیں چھلکتے لالہ زاروں میں

جہاں حوروں کے بدلے موت کے چہرے مسکراتے ہیں

جہاں کی وسعتوں پر خوف و دہشت چھائے جاتے ہیں

مثالِ شورِ محشر دل ہلاتے ہیں جہاں بادل

جہاں ہیں سسکیوں کے شور سے گونجے ہوئے جنگل

جہاں کے باغ خاروں سے بھی بدتر گل کھلاتے ہیں

جہاں کے بحرِ درد و کرب کے طوفاں اُٹھاتے ہیں

وہاں اب کاروانِ زندگانی جانے والا ہے

مری خاموش دنیا میں تلاطم آنے والا ہے

ترانۂ محبت

کبھی صبح کی مسکراتی کرن
کبھی گن گناتی بہارِ چمن
غزلخواں کبھی آبشاروں میں ہوں
گل افشاں کبھی لالہ زاروں میں ہوں
کبھی چھیڑتی ہوں تمنا کا ساز
کبھی زندگی کے اٹھاتی ہوں ناز

کبھی حُسن بَن کر سَنورتی ہوں میں
کبھی عِشق بَن کر نِکھرتی ہوں میں
کبھی غُنچہ و گُل سے ہوں ہمکلام
کبھی آسمانوں پہ محوِ خرام
کبھی آنسوؤں کے پہنتی ہوں ہار
کبھی چھیڑتی ہوں دِلوں کے سِتار
کبھی عارضِ گُل پہ شبنم ہوں میں
کبھی کوہ کا عزمِ محکم ہوں میں
جہنّم کو جنّت بناتی ہوں میں
شراروں میں گُلشن سجاتی ہوں میں
کبھی زندگی کا تبسّم ہوں میں
کبھی قُدسیوں کا ترنّم ہوں میں

اُفق پر کبھی مُسکراتی شفق
کبھی مجھ سے روشن ہیں چودہ طبق
کبھی سینہ شب میں ہوں ضَو فگن
کبھی موت کے سائے میں خندہ زن
کبھی بن کے بجلی چمکتی ہوں میں
کبھی بن کے شعلہ لپکتی ہوں میں
اندھیرے میں شمعیں جلاتی ہوں میں
حوادث سے آنکھیں ملاتی ہوں میں
کبھی سازِ ہستی کی جھنکار ہوں
خودی کی کبھی تیز تلوار ہوں
کبھی لڑکھڑاتی سنبھلتی ہوں میں
کبھی بن کے طوفاں مچلتی ہوں میں

کبھی نغمۂ موجۂ سلسبیل،
کبھی جگمگاتا دلِ جبرئیل

شکستہ دلوں میں ہے مسکن مرا
شگفتہ ہے اشکوں سے گلشن مرا

لرزتی ہے بجلی مرے نام سے
اجل بھاگتی ہے مرے دام سے

محبّت ہے

مجھے لیلاتِ فطرت کے نظاروں سے محبّت ہے

چمن ہی کیا مجھے تو خارزاروں سے محبّت ہے

جنھیں سینچا ہو اپنے خونِ دل سے باغبانوں نے

مجھے ان لہلہاتے لالہ زاروں سے محبّت ہے

جو بھر دیتی ہیں دامن گلشن و صحرا کا پھولوں سے

مجھے ان پھول برساتی بہاروں سے محبّت ہے

جگہ دیتا نہیں جن کو کوئی گلزار دامن میں
مجھے اُن زرد رُو پامال خاروں سے محبّت ہے

جو شبنم کو مزاجِ برق و آتش بخش دیتے ہیں
مجھے اُن آگ بھڑکاتے شراروں سے محبت ہے

جو ظلمت کو پیامِ صبح دے کر ڈوب جاتے ہیں
محبت ہے مجھے ان چاند تاروں سے محبت ہے

سبق دیتے ہیں جو نوعِ بشر کو عزمِ محکم کا
مجھے ان روح پرور کوہساروں سے محبت ہے

گلستاں جن کے دامن کی ہوا سے جاگ اٹھتے ہیں
مجھے ان رقص کرتے ابر پاروں سے محبت ہے

ازل سے جو ترانے زندگانی کے سناتے ہیں
محبت ہے مجھے ان جوئے باروں سے محبت ہے
بہاروں کے زمانے جن کے پہلو میں مچلتے ہیں
مجھے ان گن گناتے آبشاروں سے محبت ہے
سکھاتے ہیں جو طوفانوں سے ٹکرانا سفینوں کو
حوادث کے مجھے ان تند دھاروں سے محبت ہے

راولپنڈی ۱۹۵۷ عیسوی

آرزوئے دِل

جہاں اخلاص کے چشمے رواں ہوں
عزائم سر بلندی کے نشاں ہوں
جہاں غم کا نہ حرماں کا گزر ہو
جہاں کا ذرّہ ذرّہ نغمہ گر ہو
جہاں عیش و طرب شام و سحر ہوں
نئے انجم نئے شمس و قمر ہوں

جہاں ہر روز ہو جنگل میں منگل

جہاں جھومیں گلستانوں پہ بادل

برستے ہوں جہاں راحت کے موتی

جہاں ناشاد و محزوں ہو نہ کوئی

جہاں سایہ فگن ہو ابرِ رحمت

جہاں ہو رُوح لبریزِ مسرت

جہاں نغموں کی بارش ہو رہی ہو

کدورت کو دلوں سے دھو رہی ہو

جہاں صحرا پہ ہو گلشن کا دھوکہ

جہاں کا ذرہ ذرہ ہو شگوفہ

جہاں شاداب ہو باغِ دل و جاں

جہاں سرشار ہو روحِ پُر ارماں

جہاں ہر سُو مسرت کا سماں ہو

طرب افزا جہاں سارا جہاں ہو

جہاں ہر صبح ہو صبحِ بہاراں

جہاں ہر شام ہو شامِ زرافشاں

جہاں دُنیا ہو دُنیائے محبّت

جہاں ہو دَورِ صہبائے محبّت

جہاں غنچوں کے بھی مُنہ میں زباں ہو

جہاں مہر و وفا کا آشیاں ہو

جہاں زر کا نہ ہو کوئی پجاری
جہاں سکہ محبت کا ہو جاری
جہاں لیلائے عشرت جلوہ گر ہو
جہاں غم سے زمانہ بے خبر ہو
جہاں سینوں میں ہو طوفانِ الفت
جہاں آنکھوں میں ہو شرم و مروّت
جہاں ہو سادگی میں اک صداقت
صداقت سے جھلکتی ہو جلالت
جہاں شمعِ حقیقت جل رہی ہو
جہاں زنجیرِ ظلمت گل رہی ہو

جہاں خنداں حیاتِ جاوداں ہو

خیالِ خام مرگِ ناگہاں ہو

کھلائے دل جہاں بادِ بہاری

جہاں فطرت کا ہو فرمان جاری

جہاں نغمے لُٹائے زندگانی

جہاں دُھومیں مچاتے شادمانی

جہاں گل ریز ہو صبحِ تبسم

خموشی میں بھی ہو شانِ تکلم

جہاں لائے صبا پیغامِ الفت

چھلکتے ہوں جہاں جامِ محبت

جہاں تخلیقِ حُسن و دلکشی ہو

جہاں جلووں کی چِھٹکی چاندنی ہو

جہاں ہر لحن ہو دمسازِ اُلفت

جہاں بجتے ہوں ہر سُو سازِ اُلفت

جہاں کیفِ مسرت دائمی ہو

جہاں حُسن و شباب و زندگی ہو

جہاں حُسن و محبت کامراں ہوں

صداقت کے جہاں سکّے رواں ہوں

جہاں ہر سانس میں رُوحِ نمُو ہو

نمُو سرمایہ دارِ رنگ و بُو ہو

جہاں آباد نغموں کا جہاں ہو

مسرّت سے جہاں ہر شے جواں ہو

جہاں ہر سمت حُسنِ بیکراں ہو

محبّت کارواں در کارواں ہو

جہاں دنیا حسیں، عقبیٰ حسیں ہو

جہاں ہر شکل شکلِ دل نشیں ہو

مجھے اُس سرزمیں کی آرزو ہے

اُسی شہرِ طرب کی جُستجو ہے

۱۹۳۸ عیسوی

محبّت کے لئے ہے

یہ نُورِ سحر عارضِ گُل رنگ پہ بیتاب
یہ حُسن کہ جس پر ہے فدا گلشنِ شاداب
یہ رُوئے درخشاں ہے کہ ہنستا ہوا مہتاب
یہ مطلعِ انوار محبّت کے لئے ہے
یہ حُسنِ گہر بار محبّت کے لئے ہے

یہ موجِ تبسم ہے کہ اک نُور کا دریا
یہ گیسوئے شب رنگ یہ تابِ رُخِ زیبا
جس طرح اندھیرے میں چمکتا ہو سویرا
یہ تابشِ رخسار محبت کے لئے ہے
یہ حسنِ گہربار محبت کے لئے ہے

آواز کا یہ لوچ، یہ اندازِ تکلّم
ہر بات میں بیتاب ہے نغموں کا تلاطم
شیرینیٔ گفتار کہ ہے موجِ ترنّم
یہ شوخیٔ گُفتار محبت کے لئے ہے
یہ حسنِ گہربار محبت کے لئے ہے

یہ قالبِ الفاظ میں ڈھلتے ہوئے نغمات
غنچے کی طرح دل میں چٹکتی ہوئی ہر بات
یہ لحنِ طرب خیز کہ گاتی ہوئی برسات

یہ دولتِ بیدار محبت کے لئے ہے
یہ حسنِ گہربار محبت کے لئے ہے

بے نغمہ و بے کیف ہے ہر جنبشِ ابرو
جاگی ہوئی آنکھوں میں یہ سوئے ہوئے جادو
ہر سانس میں اک آہ ہے، ہر لفظ میں آنسو

یہ غمزۂ بیمار محبت کے لئے ہے
یہ حسنِ گہربار محبت کے لئے ہے

مرجھایا ہوا یاس سے یہ باغِ جوانی

سینے میں تمناؤں کی یہ شعلہ فشانی

آہوں کا یہ طوفان، یہ اشکوں کی روانی

اُلجھا ہوا یہ ہار محبت کیلئے ہے

یہ حُسنِ گہربار محبت کے لئے ہے

سلامِ محبّت

مرے وطن کی مہکتی ہوئی بہاروں کو
لہکتے جھومتے رنگین لالہ زاروں کو
مچلتے گاتے ہوئے مست آبشاروں کو

صبا ہماری طرف سے سلام کہہ دینا

ہر ایک راہ گزر کے حسین ذرّے کو

ہر ایک ہنستے ہوئے دل فروز غنچے کو

ہر ایک برگِ گلِ تر، ہر ایک پتّے کو

صبا ہماری طرف سے سلام کہہ دینا

لرزتے بجھتے ہوئے گاؤں کے چراغوں کو

دلوں کے خوں سے چھلکتے ہوئے ایاغوں کو

مہکتے جھومتے گاتے حسین باغوں کو

صبا ہماری طرف سے سلام کہہ دینا

حسین، دلکش و شاداب کوہساروں کو

فضا میں اُڑتے ہوئے شوخ ابر پاروں کو

اُفق پہ پچھلے پہر ڈوبتے ستاروں کو

صبا ہماری طرف سے سلام کہہ دینا

اُمڈتی گھومتی گھرتی ہوئی گھٹاؤں کو

نکھرتی، جھومتی، ہنستی ہوئی فضاؤں کو

سحر کو عطر میں ڈوبی ہوئی ہواؤں کو

صبا ہماری طرف سے سلام کہہ دینا

چھلکتی شہرِ طرب کی حسین راہوں کو

لہکتے جھومتے پودوں کی نرم باہوں کو

جہاں فروز بزرگوں کی خواب گاہوں کو

صبا ہماری طرف سے سلام کہہ دینا

گلاب و لالہ و نسریں کے کاروانوں کو

چمن فروز بہاروں کے آستانوں کو

شمیمِ گل سے، جنوں خیز گلستانوں کو

صبا ہماری طرف سے سلام کہہ دینا

سلام کہہ دینا

صبا ہمارا، وطن کو سلام کہہ دینا
ہر ایک گنجِ چمن کو سلام کہہ دینا
کلی کلی کو محبت سے پیار کر لینا
ہر ایک سرو و سمن کو سلام کہہ دینا

سلام کہنا طرب خیز آبشاروں کو
فضائے کوہ و دمن کو سلام کہہ دینا
سلام کہنا حسیں گومتی کی موجوں کو
خرامِ گنگ و جمن کو سلام کہہ دینا
سلام کہنا مرا ڈوبتے ستاروں کو
سحر کی پہلی کرن کو سلام کہہ دینا
دعائیں کہنا مری نو بنَو بہاروں کو
ہر ایک خارِ چمن کو سلام کہہ دینا

سلام کہنا محبت کے لالہ زاروں کو

دیارِ شعر و سخن کو سلام کہہ دینا

ہر ایک قطرۂ شبنم کو پیار کر لینا

بہارِ گُل کی دلہن کو سلام کہہ دینا

نثار کر کے مرے آنسوؤں کے نجم و گہر

بساطِ ارضِ وطن کو سلام کہہ دینا

سلام کہنا نشاط و طرب کی راتوں کو

عروسِ صبحِ وطن کو سلام کہہ دینا

سلام کہنا بزرگوں کی خواب گاہوں کو
غبارِ دشت و دمن کو سلام کہہ دینا
سلام کہنا مرا جھومتی گھٹاؤں کو
ادب سے خاکِ وطن کو سلام کہہ دینا

بصد خلوص و محبت، بحسرت و ارماں
تمام اہلِ وطن کو سلام کہہ دینا

احساسات

سحر کو ماند پڑ جاتی ہے جب ضو ماہِ تاباں کی
گلے ملتی ہے مجھ سے آ کے مایوسی بیاباں کی

سحر کی روشنی میں پھول جس دم مسکراتے ہیں
نہ جانے یاد کیوں گزرے ہوئے لمحات آتے ہیں

مرے سینے میں گویا برق سی اک کوند جاتی ہے
صدا شہنائی کی جب صبح کو کانوں میں آتی ہے

اُمڈ آتے ہیں آنسو چوٹ سی لگتی ہے سینے پر
شبِ عشرت میں پہلی تھاپ جب پڑتی ہے طبلے پر

۱۹۳۹ء

رباعی

بدلی ہے کہ امڈی ہی چلی آتی ہے
بوندوں کی جگہ آگ برساتی ہے
آہستہ ذرا برس اے مست بادل
سینے میں مری سانس رکی جاتی ہے